تفسیر
سورۃ الکہف

۱۸۔ الکھف

نام آیت ۹ میں اصحاب کہف کا قصہ بیان ہوا ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام ''الکہف'' ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون واقعات کی روشنی میں دوسری زندگی کا یقین پیدا کرنا ہے۔پچھلی سورہ میں خصوصیت کے ساتھ یہود کو تنبیہ تھی۔اس سورہ میں خصوصیت کے ساتھ نصاریٰ کو تنبیہ ہے۔اور اس پہلو سے ہے کہ انہوں نے اللہ کا بیٹا ہونے کا عقیدہ گڑھ لیا، جس کی وجہ سے وہ شرک کے بھی مرتکب ہوئے اور عقیدۂ آخرت بھی معطل ہو کر رہ گیا۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۸ تمہیدی آیات ہیں جن میں نزول قرآن کا مقصد واضح کیا گیا ہے۔

آیت ۹ تا ۲۶ میں اصحاب کہف کا قصہ بیان ہوا ہے جو دوسری زندگی کیلئے ایک واقعاتی مثال بھی ہے اور راہِ خدا میں ہجرت کے تعلق سے رہنمائی کا سامان بھی۔

آیت ۲۷ تا ۳۱ میں اہل ایمان کی قدر افزائی کی گئی ہے۔اور ان لوگوں کو جو دنیا پرستی میں مگن ہیں اُن کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔

آیت ۳۲ تا ۴۴ میں دو اشخاص کا قصہ بیان کیا گیا ہے جن میں سے ایک دنیا کی کامیابی ہی کو اصل کامیابی سمجھتا تھا۔اور دوسرا شخص یقین رکھتا تھا کہ آخرت کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے۔پھر دنیا کی کامیابی کو اصل کامیابی سمجھنے والے کو کس طرح کف افسوس ملنا پڑا۔

آیت ۴۵ تا ۴۹ میں دنیا کی چند روزہ زندگی کی بہار کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کرتے ہوئے قیامت کے دن کی پیشی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔اور نیک اعمال کو نتیجہ خیز اور باعث اجر قرار دیا گیا ہے۔

آیت ۵۰ تا ۵۹ میں آدم و ابلیس کا قصہ مختصراً بیان کرتے ہوئے مشرکین کی ذہنیت اور قرآن کے تعلق سے ان کے رویّہ پر گرفت کی گئی ہے۔

آیت ۶۰ تا ۸۲ میں حضرت موسیٰ کے سفر کے واقعات پیش کئے گئے ہیں جن میں حکمت الٰہی کے بعض اسرار بے نقاب کئے گئے ہیں۔اس سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ دنیا میں جو بے شمار واقعات پیش آتے ہیں ان کے صرف ظاہری پہلو کو دیکھ کر کوئی فیصلہ کن رائے قائم کرنا صحیح نہیں۔ان واقعات کے پیچھے اللہ کی حکمتیں اور مصلحتیں کارفرما ہوتی ہیں جن کا علم انسان کو نہیں ہوتا۔اور وہ اپنے ناقص علم اور جلد بازی کی بنا پر ان کی غلط توجیہ کر بیٹھتا ہے۔واقعات کا یہ پہلو کہ اس میں کیسے کیسے اسرار پوشیدہ ہوتے ہیں آخرت کے تعلق سے بڑا اہم ہے۔

آیت ۸۳ تا ۱۰۱ میں ایک سوال کے جواب میں ذوالقرنین کا قصہ بیان ہوا ہے۔اس قصہ میں اس کے کردار کا یہ پہلو خاص طور سے نمایاں کیا گیا ہے کہ کس طرح اس نے اپنے اقتدار کو خدا سے ڈرتے ہوئے اور آخرت کی جوابدہی کے احساس کے تحت استعمال کیا۔

آیت ۱۰۲ تا ۱۱۰ خاتمہ کی آیات ہیں جن میں شرک اور انکار آخرت پر تنبیہ ہے۔

سُوْرَةُ الْكَهْفِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ
لَّهٗ عِوَجًا ۜ ۱

قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ
الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۲

مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۳

وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۴

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً
تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۵

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا
بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۶

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ
اَحْسَنُ عَمَلًا ۷

وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۸

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ
اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۹

اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ
رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۱۰

(۱۸) سُورۃ الکھف

آیات ۱۱۰

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے اپنے بندہ پر کتاب اتاری اور اس میں کوئی کجی (ٹیڑھ) نہیں رکھی۔ ۱

۲ راست کتاب ۲، تاکہ وہ (لوگوں کو) سخت عذاب سے آگاہ کردے جو اس کی جانب سے پہنچے گا۔ اور ایمان لانے والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں خوشخبری دے کہ ان کے لئے اچھا اجر ہے۔ ۳

۳ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

۴ نیز ان لوگوں کو خبردار کردے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے اپنے لئے اولاد بنالی ہے۔ ۴

۵ اس بارے میں نہ ان کو کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو تھا ۵۔ بڑی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ ۶ محض جھوٹ ہے جو وہ بک رہے ہیں۔

۶ (اے پیغمبر!) شاید تم ان کے پیچھے اپنی جان مارے افسوس کے ہلاک کردو اگر وہ اس کلام پر ایمان نہیں لائے۔ ۷

۷ درحقیقت روئے زمین پر جو کچھ ہے اُسے ہم نے اس کی آرائش بنایا تاکہ لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں بہتر عمل کرنے والا کون ہے۔ ۸

۸ اور جو کچھ اس پر ہے اس کو ہم چٹیل میدان بنادینے والے ہیں۔ ۹

۹ کیا تم خیال کرتے ہو کہ کہف اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں سے کوئی عجیب چیز تھے؟ ۱۰

۱۰ جب کچھ نوجوانوں نے غار میں پناہ لی ۱۱۔ اور دعا کی اے ہمارے رب! اپنے حضور سے ہم پر رحمت فرما اور اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کا سامان کردے۔ ۱۲

۱؎ کجی (ٹیڑھ) نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں کوئی بات بھی ایسی نہیں، جو عقل وفطرت اور عدل وصداقت سے ہٹی ہوئی ہو۔ یہ فلسفیانہ اینچ پینچ، تضاد بیانی اور دور ازکار باتوں سے بالکل پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلیم الطبع اور خیر پسند لوگوں کے دلوں میں قرآن بہ آسانی اتر جاتا ہے۔ اس شان کی کتاب اتارے جانے پر اس کا مصنف (خدا) تعریف وستائش کا مستحق ہے۔ اس کتاب کا جمال اس کے مصنف کے جمال پر اور اس کا کمال اس کے مصنف کے کمال پر دلالت کرتا ہے۔ اپنے ایک ایسے بندہ پر اس کا نزول، جو رسمی تعلیم سے بالکل ناآشنا تھا اس کے کمالِ حکمت کی روشن نشانی ہے۔

قرآن کی اس امتیازی خصوصیت کا اندازہ آدمی کو اس وقت ہوتا ہے جب وہ دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں کو دیکھتا ہے۔ اور یہ دیکھ کر پریشان ہوجاتا ہے کہ ان میں خدا اور مذہب کے تعلق سے کیسی الجھی ہوئی متضاد اور فلسفیانہ اینچ پینچ والی باتیں پیش کی گئی ہیں۔ جب کہ قرآن کی تعلیمات نہایت سادہ اور دل میں اترنے والی ہیں۔

۲؎ یعنی سیدھی راہ دکھانے والی اور صحیح اور محکم تعلیمات پر مشتمل۔

۳؎ یہاں قرآن کو نازل کرنے کے دو اہم ترین مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ غفلت میں ڈوبی ہوئی انسانیت کو عذاب الٰہی سے آگاہ کرنا۔ اور دوسرے ایمان اور نیک عملی کی زندگی اختیار کرنے والوں کو اچھے اجر کی خوشخبری سنانا۔ نبی ﷺ نے یہ دوگونہ فرائض انجام دئے۔ اب آپ کی نیابت میں اس امت پر بھی ان دونوں کاموں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ قرآن کی فہمائش جہاں مسلمانوں کو کرنا ہے، وہاں پوری انسانیت کو قرآن کی تنبیہات سے آگاہ کرنا ہے۔

۴؎ یعنی ان لوگوں کو خصوصیت کے ساتھ متنبہ کردے جو اللہ کے لئے اولاد ہونے کے قائل ہیں۔ اشارہ خصوصیت کے ساتھ نصاریٰ کی طرف ہے جو حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ ویسے یہ تنبیہ عمومیت کے ساتھ ان سب کے لئے ہے جو کسی نہ کسی شکل میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا اولاد رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر مشرکین مکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔

۵؎ جو لوگ خدا کے لئے بیٹا یا اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے پاس اس دعویٰ کے پیچھے کوئی علمی دلیل نہیں ہے۔ خدا کے بارے میں انسان کو علم یا تو اس شعور کی بنا پر ہوتا ہے جو انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہوا ہے۔ یا ان نشانیوں کے ذریعہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے آفاق وانفس میں رکھی ہیں۔ یا پھر وحی کے ذریعہ جو وہ انبیاء علیہم السلام پر بھیجتا ہے اور جس کی نمایاں ترین شکل کتاب الٰہی ہے۔ اس کے علاوہ اللہ کے بارے میں جاننے کا ذریعہ انسان کے پاس کوئی نہیں۔ ان تینوں ذریعوں میں سے کوئی ذریعہ بھی ایسا نہیں ہے جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہو کہ خدا اولاد رکھتا ہے۔ بلکہ ہر ذریعہ اس کی نفی کرتا ہے۔ پھر کس بنیاد پر لوگ خدا کے لئے اولاد یا بیٹا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں؟ رہی ان کی یہ بات کہ یہ عقیدہ باپ دادا سے چلا آرہا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ خدا کے اولاد ہے۔ بلکہ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے باپ دادا بھی ویسے ہی جہالت کی باتیں کرتے تھے جیسے یہ کررہے ہیں۔

۶؎ یعنی خدا کے بارے میں اولاد کی بات کہنا لوگ آسان خیال کرتے ہیں۔ اور کسی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ حالانکہ کسی بھی عیب اور کمزوری کو اللہ کی طرف منسوب کرنا سنگین گناہ ہے۔

۷؎ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی ﷺ اپنی قوم کے لئے بڑے خیر خواہ تھے اور ان کے ایمان نہ لانے کا آپ کو کس قدر صدمہ تھا۔ آپ ایک دردمند انسان تھے اس لئے یہ کس طرح گوارہ کرسکتے تھے کہ آپ ﷺ کی قوم عذاب سے دوچار ہوجائے۔ مگر تنبیہ اور نصیحت کے بعد بھی لوگ اپنے کو نذر آتش کرنا چاہتے ہوں تو ان پر افسوس کرنے سے کیا حاصل۔ اسی لئے نبی ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ ان لوگوں کے سلسلہ میں تم اپنا فرض ادا کرچکے ہو۔ اب اگر یہ نہیں مانتے تو ان کے ایمان نہ لانے کے غم میں تم نہ گھلو۔ اس میں جہاں رسول کی اپنی قوم سے دردمندی کا اظہار ہے، وہاں ایمان نہ لانے والوں پر عتاب بھی ہے کہ یہ اس لائق نہیں ہیں کہ انہیں سمجھایا جائے۔

۸؎ یعنی دنیا ہے تو پُر بہار مگر وہ سدا بہار نہیں ہے۔ اور اس کو پُر کشش اس لئے بنادیا گیا ہے کہ نوع انسانی کی آزمائش ہو، کہ کون اس کی دلفریبیوں میں آکر دنیا

کا پرستار بنتا ہے۔اور کون عقل وفکر اور صبر وضبط سے کام لے کر اور خدا کی رہنمائی کو قبول کر کے اپنے کو بہترین اوصاف کا انسان ثابت کر دکھاتا ہے۔اور اس دوسری قسم کے انسانوں ہی کو سدا بہار جنت میں بسایا جائے گا۔

۹۔ یعنی قیامت کے دن اس زمین کی ساری بہار ختم ہو کر رہ جائے گی۔انسان جو کچھ اس پر تعمیر کرتا اور بناتا رہا ہے وہ سب مٹی میں مل جانے والا ہے۔ قیامت کا دھماکہ انسان کی ساری مادی اور تمدنی ترقیوں کو ملیامیٹ کر کے رکھ دے گا۔پھر ایسی چیز کو مقصود بنانے سے کیا فائدہ ؟

۱۰۔ اصحاب کہف کا قصہ عیسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں سے تعلق رکھتا تھا۔لیکن یہ اس قدر مشہور ہو گیا تھا کہ اہل مکہ بھی جاننے لگے تھے۔اور اس کو ایک عجیب و غریب واقعہ خیال کرتے تھے۔چونکہ یہ واقعہ انسان کے دوبارہ اٹھائے جانے کی ایک نمایاں مثال ہے اس لئے قرآن نے اس کے ضروری پہلو اجاگر کئے۔

ان ہی عربوں سے خطاب کر کے قرآن نے سوال کیا کہ کیا تم اصحاب کہف کے واقعہ کو عجیب خیال کرتے ہو؟ حالانکہ یہ واقعہ قدرت الٰہی کی بہت سی نشانیوں میں سے ایک نشانی کا ظہور تھا، جو انسان کے دوبارہ اٹھائے جانے پر دلالت کرتا ہے۔تم واقعہ کے ظاہری پہلو کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔مگر اس کے اندر دوسری زندگی کے وقوع پر دلالت کرنے والی جو رہنمائی تھی اس سے تم نے آنکھیں بند کر لیں۔

کہف کے معنیٰ عربی میں وسیع غار کے ہیں اور الرقیم کے معنیٰ تحریر کے ہیں۔اس مناسبت سے الرقیم سے مراد مفسرین کے ایک گروہ کے نزدیک کتبہ ہے، جو ان کے بقول اصحاب کہف کی یادگار کے طور پر غار پر لگایا گیا تھا۔اور جس شہر میں یہ واقعہ پیش آیا اس کا نام افسس (Ephesus) بتلایا جاتا ہے جو رومیوں کا ایک بڑا شہر تھا اور موجودہ ترکی میں واقع تھا۔جس ظالم حکمراں کے ظلم وستم سے تنگ آ کر اصحاب کہف نے پناہ لی تھی اس کا نام دقیانوس بتلایا جاتا ہے جس کا زمانہ تیسری صدی عیسوی تھا۔موجودہ دور کے ایک مفسر نے الرقیم سے نبطیوں کا مشہور تاریخی شہر پیٹرا (بطرا) مراد لیا ہے۔لیکن یہ تمام تفصیلات عیسائیوں کی روایات سے ماخوذ ہیں جن میں قصہ گوئی اور قیاس آرائی کا بہت زیادہ دخل ہے۔اسی لئے قرآن نے آیت ۲۲ میں یہ واضح حکم دیا تھا کہ اصحاب کہف کے بارے میں ان لوگوں سے (خواہ مشرک ہوں یا نصاریٰ) کچھ نہ پوچھا جائے۔البتہ ایک جدید تحقیق جو استاد محمد تیسیر ظبیان نے اردن کے دائرۃ الآثار العامۃ کے تعاون سے پیش کی ہے، وہ بڑی حد تک اس غار پر منطبق ہوتی ہے جس کا ذکر قرآن میں ہوا ہے۔فاضل محقق نے اپنی ''کتاب ''اھل الکہف'' میں اس پر محققانہ بحث کی ہے اور یہ کتاب جو عربی میں ہے دارالاعتصام مصر سے شائع ہوئی ہے۔اس تحقیق کی رو سے یہ غار عمان (اردن کے دارالحکومت) سے آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر الرجیب میں واقع ہے اور یہ الرجیب ہی الرقیم کی بدلی ہوئی شکل ہے۔حکومت اردن کے دائرہ آثار عامہ نے کھدائی وغیرہ کا جو کام کیا اس کے بعد حقائق بالکل ابھر کر سامنے آ گئے ہیں جو مختصراً درج ذیل ہے۔

۱) یہ غار جنوب شمال جہت میں واقع ہے اور سورج مشرق اور مغرب کی سمت میں غار سے کترا کر نکل جاتا ہے۔

۲) غار اندر سے کشادہ ہے جیسا کہ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے۔وھم فی فجوۃ منہ۔

۳) غار کے اندر آٹھ قبریں ہیں۔

۴) غار کے اوپر مسجد کے کھنڈر ہیں مسجد کا ذکر آیت ۲۱ میں ہوا ہے۔اس مسجد کے سات ستون ہیں جو غالباً اصحاب کہف کی تعداد کی مناسبت سے قائم کئے گئے تھے۔

۵) شمالی دیوار پر ایک جانور کی تصویر بنی ہوئی ہے جس کے بارے میں ماہرین آثار کا کہنا ہے کہ یہ کتے کی تصویر ہے۔علاوہ ازیں دیوار پر فینیقی اور قدیم یونانی خط میں کچھ باتیں کندہ ہیں۔

۶) اصحاب کہف کے غار میں پناہ لینے کا واقعہ دقیانوس کے زمانہ کا نہیں بلکہ تراجان کے زمانہ کا ہے جس نے ۹۸ء سے ۱۱۷ء تک حکومت کی اور ۱۰۹ء میں اس نے شرق اردن فتح کر لیا تھا۔یہ حکمراں بڑا ظالم تھا اور جو شخص بھی بت پرستی سے اور بتوں کے آگے قربانیاں پیش کرنے سے انکار کرتا، اسے موت کے گھاٹ

اُتار دیتا تھا۔اس کے زمانہ میں عیسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں پر سخت مظالم ڈھائے گئے۔اس کے عہد کے بیزنطینی سکے بھی اس غار میں ملے ہیں۔

۷) مسلم مؤرخین کے اقوال سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہ غار عمان کے قریب واقع ہے۔چنانچہ مقدسی کی کتاب احسن التقاسیم میں ہے ''الرقیم شرق اردن میں عمان سے قریب ایک شہر ہے''۔اور یاقوت حموی معجم البلدان میں لکھتے ہیں۔''عمان شام کے اطراف میں ایک شہر ہے اور یہ سرزمین بلقاء کا بڑا شہر رہا ہے اس کے قریب ہی کہف اور الرقیم واقع ہیں۔''ان تمام تفصیلات کے لئے دیکھئے محمد تیسیر ظبیان کی کتاب اہل الکہف)

ہماری رائے میں یہ تحقیق نہایت دقیق اور مسیحی روایتوں اور کمزور اقوال کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہے۔کہف اور الرقیم کے سلسلہ میں چونکہ یہ نیا انکشاف ہے اس لئے ہمیں اس کی تشریح میں کسی قدر طوالت سے کام لینا پڑا۔

۱۱؎ یعنی تعداد کی تفصیلات میں گئے بغیر یہ جان لینا کافی ہے کہ وہ چند نوجوان تھے،جنہوں نے اپنے ایمان کے تحفظ کے لئے غار میں پناہ لی تھی۔ایک ظالم بستی میں سے چند نوجوانوں کا پوری قوتِ ایمانی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہونا ان کی حمیتِ حق اور بلند حوصلگی کی علامت ہے۔اور یہ چیز نوجوانوں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔

۱۲؎ اپنے دین کے تحفظ اور اپنے دعوتی کام کیلئے اللہ سے مدد اور رہنمائی کے طالب ہوئے۔اور اللہ تعالیٰ نے ان کی جس طرح مدد اور رہنمائی کی وہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہے۔

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ﴿١١﴾

۱۱ تو ہم نے غار میں ان کے کان کئی سال کیلئے تھپک دئے۔ ۱۳؎

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ﴿١٢﴾

۱۲ پھر ہم نے ان کو اٹھایا تا کہ دیکھیں دونوں گروہوں میں سے کون ان کے قیام کی مدت کا صحیح شمار کرتا ہے۔ ۱۴؎

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿١٣﴾

۱۳ ہم ان کا واقعہ تم کو ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں ۱۵؎۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں افزونی عطا کی تھی۔ ۱۶؎

وَّرَبَطْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ﴿١٤﴾

۱۴ اور ان کے دلوں کو ہم نے مضبوط کیا جب کہ وہ اٹھے اور کہا کہ ہمارا رب تو وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اس کے سوا کسی دوسرے معبود کو ہرگز نہیں پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو نہایت غلط بات کہیں گے۔ ۱۷؎

هٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا ﴿١٥﴾

۱۵ یہ ہماری قوم ہے جو اس کو چھوڑ کر دوسرے معبود بنا بیٹھی ۱۸؎۔ یہ لوگ اس کی تائید میں کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے ۱۹؎؟ پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔ ۲۰؎

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿١٦﴾

۱۶ اب جب کہ تم ان سے اور ان کے معبودوں سے جن کی وہ اللہ کے سوا پرستش کرتے ہیں الگ ہو گئے ہو تو غار میں پناہ لو ۲۱؎۔ تمہارا رب اپنی رحمت کا تم پر فیضان کرے گا اور تمہارے اس کام کے لئے سروسامان مہیا کرے گا۔ ۲۲؎

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿١٧﴾

۱۷ اور تم سورج کو دیکھتے کہ جب وہ طلوع ہوتا ہے تو ان کے غار سے دائیں جانب ہٹا ہوا رہتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان کے بائیں جانب کترا کر نکل جاتا ہے اور وہ اس کے اندر ایک کشادہ جگہ میں پڑے ہیں ۲۳؎۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے ۲۴؎۔ جس کو اللہ ہدایت دے وہی راہ یاب ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دے تو تم کسی کو اس کا مددگار، رہنمائی کرنے والا نہ پاؤ گے۔

۱۳؎ یعنی ان کو کئی سال تک غار میں سلائے رکھا۔ کانوں کو تھپکنا سلانے کے لئے استعارہ ہے۔ چنانچہ بعد کی آیت میں ان کے اٹھائے جانے کا ذکر ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ ان پر نیند طاری کر دی گئی تھی۔ نیز آیت ۱۸ میں بھی یہ صراحت ہے کہ وہ سو رہے تھے۔

۱۴؎ دو گروہ سے مراد ایک تو اصحاب کہف کا گروہ ہے۔ اور دوسرا ان لوگوں کا جن سے ان کو اٹھنے کے بعد واسطہ پڑا۔ جہاں تک اصحاب کہف کا تعلق ہے وہ اپنی مدتِ قیام کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکے، بلکہ جیسا کہ آیت ۱۹ سے واضح ہے انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ہم نے چند گھنٹے ہی سو کر گذارے ہیں۔ رہے شہر کے لوگ جن سے ان کو اٹھنے کے بعد واسطہ پڑا، تو وہ سکہ وغیرہ دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ غار میں طویل مدت تک سوتے رہے ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ طویل مدت تک ان کا پڑے رہنا ایک واقعہ تھا۔ مگر اس کا احساس خود پڑے رہنے والوں کو نہ ہو سکا۔ گویا یہ برزخ کی زندگی کی مثال تھی جہاں انسان طویل عرصہ تک پڑا رہے گا۔ لیکن قیامت کے دن جب اسے اٹھایا جائے گا تو ایسا محسوس ہوگا کہ اس نے چند گھنٹے ہی عالم برزخ میں گذارے ہیں۔ وقت کی طوالت کا احساس نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ جس شخص کی موت ہوگئی اس کی گویا قیامت قائم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے واقعہ سے اسی حقیقت کو ظاہر کر دیا ہے۔

۱۵؎ اوپر کی آیتوں میں اس سرگزشت کا لبِّ لباب پیش کیا گیا تھا اب اس کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

اس سرگزشت کو ٹھیک ٹھیک سنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس واقعہ کے سلسلہ میں جو الٹکل پچو باتیں کہی جا رہی ہیں، ان کے مقابلہ میں قرآن کا بیان خالصۃً حقیقتِ واقعہ کا بیان ہے۔ اور اس کا ایک ایک لفظ سچائی کا آئینہ دار ہے، نیز اپنے پہلو میں مقصدیت لئے ہوئے ہے۔

۱۶؎ معلوم ہوا کہ ہدایت میں افزونی اور ترقی بھی ہوتی ہے اور یہ افزونی اور ترقی اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔

۱۷؎ اصحاب کہف کا یہ اعلان توحید تھا اور چونکہ انہوں نے نہایت پُرخطر حالات میں اس کا اعلان کیا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا اور ان کے حوصلے بلند کر دیئے۔ چنانچہ انہوں نے بت پرستی سے ڈر کر بت پرستی کے ساتھ کوئی مصالحت نہیں کی۔ اور غیر اللہ کو معبود ماننے سے صاف صاف انکار کر دیا۔

۱۸؎ معلوم ہوا کہ اصحاب کہف کی قوم مشرک تھی۔

۱۹؎ یعنی شرک اور بت پرستی بالکل بے بنیاد ہے۔ اگر اس کی کوئی دلیل ہے تو پھر بتوں کے پرستار اسے پیش کیوں نہیں کرتے۔ اور ایک بے دلیل بات وہ دوسروں سے کیوں منوانا چاہتے ہیں۔

۲۰؎ یہ عقیدہ کہ خدا نے اپنی خدائی میں دوسروں کو شریک ٹھہرایا ہے یا خدائی کے اختیارات ان میں تقسیم کر دئے ہیں یا ان کو لائق پرستش قرار دیا ہے سراسر جھوٹ اور اللہ پر بہتان ہے۔ کیوں کہ اللہ نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کہی پھر جو جھوٹ اللہ پر بولا جائے وہ کتنی سنگین نوعیت کا ہوگا اور اس کا مرتکب کتنا بڑا مجرم ہوگا۔

۲۱؎ غار میں پناہ لینے کا فیصلہ انہوں نے حالات کی سنگینی کے پیش نظر کیا تھا، جبکہ آیت ۲۰ سے واضح ہے کہ ان کی قوم بت پرست تھی اور عقیدہ و مذہب کی آزادی کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اور حکومت ایسی ظالم تھی کہ ایک خدا کو ماننے اور بت پرستی سے انکار کرنے والے کو موت کے گھاٹ اتارتی تھی۔ ان حالات میں اصحاب کہف نے اپنے ایمان کو بچانے کے لئے غار میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اصل چیز اپنے ایمان اور دین کا تحفظ ہے۔ اور اگر حالات اتنے سنگین ہوں کہ یہ متاع عزیز ہی خطرہ میں پڑ جائے، تو ایک مؤمن اس کے تحفظ کے لئے ہجرت کی راہ اختیار کر سکتا ہے یا کسی غار وغیرہ میں بھی پناہ لے سکتا ہے۔ ایسے ہی موقع کے لئے حدیث میں آیا ہے:

''قریب ہے کہ مسلمان کا بہترین مال اس کی بھیڑیں ہوں، جن کو لے کر وہ پہاڑ پر یا کسی ایسے گوشہ میں جہاں خوب بارش ہوتی ہو چلا جائے تا کہ اپنے دین کو فتنوں سے بچا سکے۔'' (بخاری کتاب الایمان)

واضح رہے کہ اس کا کوئی تعلق نہ رہبانیت سے ہے اور نہ صوفیوں کی عزلت نشینی سے۔ بلکہ یہ ایسے پُرفتن حالات کیلئے ہے جب کہ اپنے ایمان اور دین کو بچانے

کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو۔

۲۲۔ عربی کا اسلوب یہ ہے کہ جب کسی گروہ کے افراد آپس میں ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے ہیں۔تو تم اور تمہارا کی ضمیریں استعمال کی جاتی ہیں۔ عربی کے اس اسلوب کو اگر سامنے نہ رکھا جائے،تو یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ خطاب کرنے والا آپس کا آدمی نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔

اصحاب کہف نے اللہ کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہی، کہ جب ہم نے خدائے واحد ہی کو معبود مانا ہے اور شرک اور مشرکین سے علیٰحدگی اختیار کر لی ہے،تو اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی رحمت سے ضرور نوازے گا۔اور جس کام کو لے کر ہم اٹھے ہیں اس میں وہ ہماری ضرور مدد کرے گا۔

۲۳۔ یعنی وہ جس غار میں پناہ گزیں ہوئے وہ اس طرح واقع ہوا ہے، کہ سورج کی روشنی اندر کی کشادہ جگہ میں جس میں وہ پڑے سو رہے تھے نہیں پہنچتی۔ مطلب یہ کہ غار جنوب شمال جہت کو ہے۔

۲۴۔ نشانی اس بات کی کہ جو اللہ پر توکل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی کس طرح مدد کرتا ہے۔اصحاب کہف کی ایک ایسے غار کی طرف رہنمائی جو ان نازک حالات میں ان کے تحفظ کے لئے ہر طرح سے موزوں تھا اور جس میں ان کو سکون میسر آیا۔اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کی نازک مواقع پر مدد کرتا اور رہنمائی فرماتا ہے۔

کھف اور الرقیم

الرقیم پہاڑ کا منظر اور غار کے اوپر بنی ہوئی قدیم مسجد

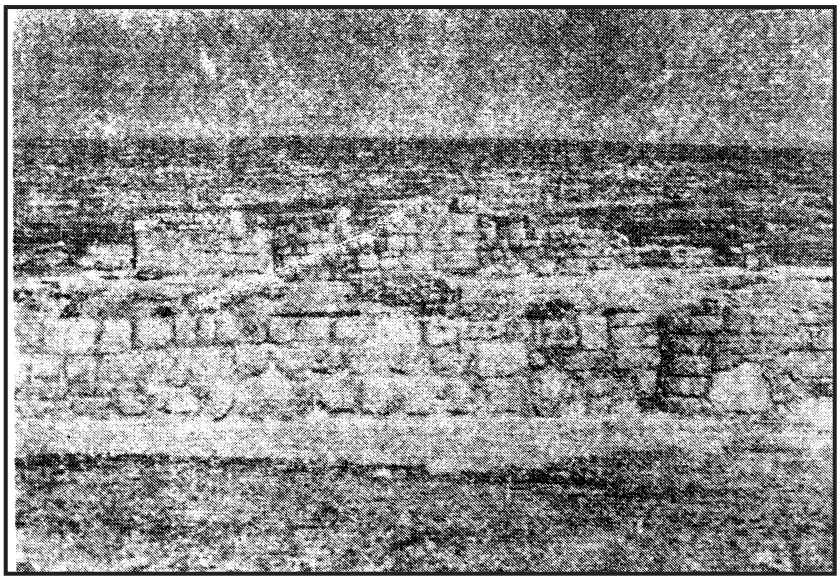

غار کے سامنے کا منظر اور اس کے اوپر بنی ہوئی قدیم مسجد کے کھنڈر

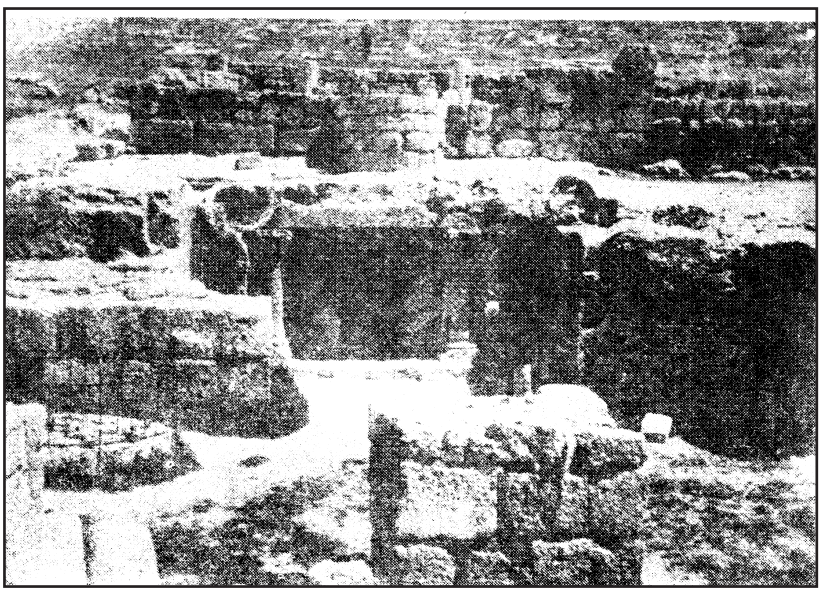

وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۚ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ ۚ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۭ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾

۱۸ تم ان کو دیکھ لیتے تو خیال کرتے کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سو رہے تھے۔ ہم ان کو دائیں بائیں کروٹیں دلواتے رہتے تھے۔ اور ان کا کتا (غار کے) دہانے پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ اگر تم انہیں جھانک کر دیکھتے تو الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تم پر ان (کے منظر) سے دہشت طاری ہوتی۔ ۲۵

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۭ قَالَ قَاۗىِٕلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۭ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۚ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾

۱۹ اور اسی طرح ہم نے انہیں اٹھایا ۲۶ تاکہ وہ آپس میں پوچھ گچھ کریں ۲۷۔ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کتنی دیر رہے؟ انہوں نے جواب دیا ایک دن یا اس سے کم رہے ہوں گے۔ پھر وہ بولے تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ تم کتنی دیر رہے ۲۸۔ اب ایک آدمی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر میں بھیجو۔ وہ دیکھے کہ کس کے ہاں پاکیزہ کھانا ملتا ہے ۲۹۔ وہاں سے وہ تمہارے لئے کچھ کھانا لائے۔ اور چپکے سے یہ کام کرے۔ کسی کو ہماری خبر نہ ہونے دے۔

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾

۲۰ اگر ان کو خبر ہوئی تو وہ تمہیں سنگسار کر دیں گے یا اپنے مذہب میں واپس لے جائیں گے ۳۰۔ اگر ایسا ہوا تو تم کبھی فلاح نہ پا سکو گے۔

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۭ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

۲۱ اس طرح ہم نے لوگوں کو ان (کے حال) سے واقف کر دیا۔ ۳۱۔ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے دن میں کوئی شبہ نہیں ۳۲۔ جب لوگ ان کے معاملے میں جھگڑ رہے تھے ۳۳۔ انہوں نے کہا ان پر ایک دیوار کھڑی کر دو۔ ان کا رب ہی ان کو بہتر جانتا ہے ۳۴۔ جو لوگ ان کے معاملہ پر غالب تھے انہوں نے کہا ہم ضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۭ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَاۗءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

۲۲ یہ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور یہ بھی کہیں گے کہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں ۳۵۔ کچھ اور لوگ کہیں گے کہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کہو میرا رب ہی ان کی تعداد کو بہتر جانتا ہے۔ کم ہی لوگ ان کی تعداد سے واقف ہیں۔ لہٰذا تم ان کے معاملہ میں لوگوں سے بحث نہ کرو بجز سرسری بحث کے اور نہ ان کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھو۔ ۳۶

۲۵۔ یعنی وہ اس طرح سو رہے تھے اور ساتھ ہی کروٹیں بدلتے جاتے تھے، کہ اگر اتفاق سے کوئی شخص انہیں دیکھ لیتا تو یہی خیال کرتا کہ یہ بس لیٹے ہوئے ہیں۔ اور جاگ رہے ہیں۔ اور ان کا کتا بھی غار کے دہانے پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ اگر اس تاریک غار میں کوئی شخص جھانک کر دیکھ لیتا تو یہ منظر ایسا دہشتناک تھا کہ دیکھنے والا الٹے پاؤں بھاگ جاتا۔ وہ اندیشہ محسوس کرتا کہ معلوم نہیں یہ کون لوگ ہیں جو اس تاریک غار میں چھپ گئے ہیں۔ اور ان کے ارادے کیا ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ دہشت ناک صورت اس لئے پیدا کر دی تھی کہ کوئی شخص ان کے قریب آنے کی جرأت نہ کرے اور وہ بالکل محفوظ رہیں۔ ان کی حفاظت کا یہ غیر معمولی سامان تھا جو کیا گیا۔

کتّا انہوں نے اس ویرانے میں اپنی حفاظت کے لئے ساتھ رکھا تھا، جو ایک جائز غرض تھی۔ اس لئے شرعاً اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

۲۶۔ یعنی اس غیر معمولی حالت میں سلانے کے بعد انہیں اٹھایا۔

۲۷۔ یعنی وہ ایک دوسرے سے یہ معلوم کریں کہ وہ کتنی دیر سوتے رہے۔

۲۸۔ ان کی آپس کی گفتگو سے ظاہر ہوا کہ وہ نیند کی حالت میں پڑے رہنے کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔ ایک نے اندازہ لگایا تو ایک دن یا اس سے کم کا، اور جب وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے تو انہوں نے اس معاملہ کو اللہ پر چھوڑ دیا، کہ وہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے عرصہ اس حال میں پڑے رہے۔

درحقیقت وہ ایک طویل عرصہ تک پڑے رہے۔ مگر جب جاگ اٹھے ہیں تو انہیں ایسا محسوس ہوا کہ گویا ایک دن یا اس سے بھی کم وقت انہوں نے سونے میں گذارا ہے۔ ان کا یہ واقعہ عالم برزخ کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک نشانی ہے۔ انسان مرنے کے بعد طویل عرصہ تک عالم برزخ میں پڑا رہے گا اور جب قیامت کے دن اٹھایا جائے گا تو اسے ایسا محسوس ہوگا، کہ ایک دن یا چند گھنٹے ہی وہ اس حالت میں پڑا رہا۔

۲۹۔ جاگنے کے بعد انہیں کھانے کی اشتہاء ہوئی۔ اس لئے انہوں نے اپنے ایک آدمی کو سکہ دے کر جو چاندی کا تھا شہر میں بھیجنا چاہا، اور اسے یہ ہدایت کی کہ تحقیق کر کے پاکیزہ کھانا لے آئے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ شہر کا ماحول وہی مشرکانہ ہے جس کو چھوڑ کر وہ آئے تھے۔ اور ایک مشرکانہ سوسائٹی میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ بتوں کے نام کا ذبیحہ بھی ہو سکتا ہے، اس لئے انہوں نے پاکیزہ یعنی حلال کھانے کی تاکید کی۔ اس سے ان کی پاکیزگی نفس کا اندازہ ہوتا ہے۔

۳۰۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جس قوم کو وہ چھوڑ آئے تھے وہ کیسی ظالم تھی۔ ان کے نزدیک ان کے مشرکانہ مذہب کو ترک کر دینے کی سزا موت تھی، نیز یہ کہ وہ اپنے مذہب میں واپس لانے کے لئے جبر کرتے تھے۔

۳۱۔ وہ شخص جب پرانے زمانے کا سکہ لے کر کھانا خریدنے کے لے گیا تو راز کھل گیا، کہ یہ لوگ طویل مدت تک غار میں پڑے سوتے رہے ہیں اور اب جاگ اٹھے ہیں۔ یہ وہ اسباب تھے جو اللہ نے لوگوں کو ان کے حال سے واقف کرانے کے لئے کئے۔

۳۲۔ اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کا سامان اس لئے کیا، تاکہ قیامت کے بارے میں لوگوں کے شبہات دور ہوں۔ اور انہیں یقین ہو جائے کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ اگر اللہ کے کرشمۂ قدرت سے انسان لمبی مدت تک سوتے رہنے کے بعد اٹھ سکتا ہے، تو اس کے کرشمۂ قدرت سے وہ مرنے کے بعد کیوں نہیں اٹھ سکتا؟ اگر اس دنیا میں خلاف معمول (خارق عادت) واقعہ ظہور میں آ سکتا ہے، تو اس دنیا کے خاتمہ پر دوبارہ اٹھائے جانے کا خلاف معمول واقعہ کیوں نہیں پیش آ سکتا؟

۳۳۔ فحوائے کلام (انداز بیان) سے واضح ہے کہ اس کے بعد اصحاب کہف کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کے انتقال پر یہ غیر ضروری بحث چھڑ گئی کہ ان کو کس طرح دفن کیا جائے اور ان کی یادگار کس طرح قائم کی جائے۔

۳۴۔ اس وقت حکومت بھی بدل چکی تھی اور عوام کا دین بھی۔ عوام اور حکومت دونوں نے نصرانیت قبول کر لی تھی۔ اس لئے اصحاب کہف سے دونوں کو عقیدت ہو گئی تھی۔ کہاں تو وہ ماحول کہ عوام اور حکومت دونوں ان کو سنگسار کرنے کے درپے تھے۔ اور کہاں یہ ماحول کہ دونوں ان کے عقیدت مند ہو گئے۔ اور جب

عقیدت مند ہو گئے تو اعتدال باقی نہ رہا۔ ان کو مرجع بنانے کے لئے ان کی قبروں کے اوپر مساجد (عبادت گاہ) کی تعمیر ضروری سمجھی گئی۔

اگر چہ ان لوگوں میں ایک گروہ ایسا موجود تھا جس کا اندازہ صحیح تھا۔ اور اس نے یہ مناسب تجویز پیش کی تھی کہ ان لاشوں کو غار ہی میں رہنے دیا جائے اور غار کے دہانے پر دیوار کھڑی کر دی جائے تا کہ وہ اس میں مدفون ہوں۔ اور ان کے معاملہ کو اللہ پر چھوڑ دیا جائے، جو ان کے حال سے بخوبی واقف ہے۔ ہم فرطِ عقیدت میں کوئی ناروا کام نہ کر بیٹھیں۔ مگر موحدین کی یہ تجویز ان لوگوں کیلئے قابل قبول نہیں ہوئی، جن کے ہاتھ میں کلیسا کا اقتدار اور حکومت کی باگ دوڑ تھی۔ انہوں نے اپنی بگڑی ہوئی ذہنیت اور بدعت پرستانہ طبیعت کے پیش نظر اس بات کا فیصلہ کیا کہ ان کی قبروں پر یعنی غار کے اوپر ایک عبادت گاہ تعمیر کی جائے تا کہ ان سے عقیدت کا اظہار ہو۔

قبروں سے یہی وہ عقیدت ہے جو قبر پرستی اور گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر عمارتیں تعمیر کرنے اور مسجدیں بنانے کی سختی کے ساتھ ممانعت فرمائی ہے۔

لَعَنَ اللّٰہ الیھود والنصاریٰ اِتخذُوْا قُبُورَ اَنْبِیَاءِھِمْ مَسْجِدًا۔ (بخاری کتاب الجنائز)

''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے۔ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا۔''

اُولٰئِکَ اِذَا مَاتَ مِنْھُمُ الرَّجُلُ الصالحُ بَنَوْا عَلیٰ قبرہٖ مسجداً وصَوَّرُوْا فِیْہِ تِلکَ الصُّوَرَ اُوْلٰئِکَ شرارُ الخَلْقِ عِنْدَاللّٰہِ۔

''ان لوگوں میں جب کوئی نیک شخص مرجاتا تو اس کی قبر پر وہ عبادت گاہ (مسجد) بناتے اور اس میں اس کی تصویریں بناتے۔ یہ لوگ اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق ہونگے۔'' (بخاری کتاب الجنائز)

نَھیٰ رسول اللّٰہ ﷺ اَنْ یُّجَصَّصَ الْقَبْرِ وان یُّقْعَدَ عَلَیْہِ وَاَنْ یُبْنیٰ عَلَیْہِ ط (مسلم کتاب الجنائز)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو چونے سے پختہ کرنے، اس پر بیٹھنے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے۔''

ان حدیثوں کے پیش نظر بزرگوں کی قبروں پر شاندار مقبروں اور درگاہوں کی تعمیر، اسلامی تعلیمات کے صریح خلاف اور قبر پرستی اور گمراہی کا باعث ہے۔

بعض حضرات نے اس آیت کا غلط مفہوم لیا ہے۔ اور وہ اس آیت کو بزرگوں کی قبروں پر مسجد تعمیر کرنے کے جواز میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن حدیث نبوی کی صراحت کے بعد ان کا یہ استدلال بالکل باطل ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں ان پر سخت گرفت کی ہے۔ اور ان کی الٹی منطق کا خوب جائزہ لیا ہے۔ اور واضح طور پر صلحاء کی قبروں پر عمارت بنانے کے جواز کو باطل اور فاسد قول قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو روح المعانی ج ۵ ص ۲۳۷)

آیت کو اگر پوری طرح سے ملحوظ رکھا جائے تو اس کا یہ منشاء واضح ہوگا کہ اصحاب کہف کو طویل مدت کے بعد اٹھا کر، اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقوع پر ایک نشانی لوگوں کے لئے فراہم کر دی تھی۔ اس لئے چاہئے تھا کہ وہ اپنی نگاہوں کو اس پر مرتکز کرتے۔ اور اصحاب کہف کے تعلق سے جب گفتگو کرتے تو اسی نقطہ کو اصل موضوع بنا لیتے۔ مگر ان کے عقیدت مندوں نے اصل موضوع کو چھوڑ کر ان کی یادگار قائم کرنے کو موضوع بنالیا۔

۳۵۔ یعنی یہ سب اٹکل پچو باتیں ہیں۔

۳۶۔ جن لوگوں کو اصل مقصد سے لگاؤ نہیں تھا اور جو اس واقعہ سے کوئی سبق حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے اصحاب کہف کی تعداد وغیرہ کے بارے میں غیر ضروری بحثیں چھیڑ دی تھیں۔ قرآن نے ان کی ان بحثوں کا جواب دئے بغیر بچے تلے انداز میں سرگزشت سنائی اور سبق آموز پہلوؤں کو نمایاں کیا۔ ساتھ ہی اہل ایمان کو ہدایت کی کہ ان بحثوں سے سرسری طور سے گزریں اور ان میں الجھیں نہیں۔

تعداد کے بارے میں قرآن نے تیسرے قول کو (کہ ان کی تعداد سات تھی) پہلے دو اقوال کی طرح رد نہیں کیا اور نہ اس کے صحیح ہونے کی صراحت کی۔ بلکہ

فرمایا کہو میرا رب ہی ان کی تعداد کو بہتر جانتا ہے۔ لہٰذا ہمیں کسی کاوش کے بغیر اسی ہدایت پر عمل کرنا چاہئے۔

معلوم ہوتا ہے اصحاب کہف کے قصہ نے اس زمانہ میں ہی افسانہ کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ قرآن نے اسکی اصل حقیقت کو جو افسانوں میں دب گئی تھی منظر عام پر لانے کے بعد اہل ایمان کو ہدایت کی، کہ اب اس قصہ کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، لہٰذا کسی سے کوئی سوال نہ کیا جائے۔ مگر افسوس ہے کہ قرآن کی اس واضح ہدایت کے باوجود تفسیروں میں عیسائیوں کی افسانوی باتوں کو جگہ مل گئی یہاں تک کہ اصحاب کہف کے نام نیز ان کے کُتّے کا نام بھی بیان کر دیا گیا۔

❑❑❑❑❑❑

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾

۲۳ اور کسی چیز کے بارے میں یہ نہ کہو کہ میں کل اسے کروں گا۔

اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَقُلْ عَسٰۤی اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

۲۴ مگر یہ کہ اللہ چاہے ۳۷۔ اگر تم بھول جاؤ تو اپنے رب کو یاد کرو ۳۸۔ اور کہو امید ہے میرا رب اس سے بھی زیادہ رشد کی طرف میری رہنمائی فرمائے گا۔ ۳۹

وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾

۲۵ اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے اور مزید نو سال۔

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

۲۶ کہو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت رہے ۴۰۔ آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کا علم اسی کو ہے۔ کس شان کا ہے وہ دیکھنے والا اور سننے والا! اس کے سوا ان کا کوئی کارساز نہیں۔ اور وہ اپنے ''حکم'' میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ ۴۱

وَاتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾

۲۷ اور تمہارے رب کی جو کتاب تم پر وحی کی گئی ہے اسے سناؤ۔ ۴۲ اس کے فرمانوں کو کوئی بدل نہیں سکتا ۴۳۔ اور اس کے سوا تم کو کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۚ وَلَا تَعْدُ عَیْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

۲۸ اور ان لوگوں کی رفاقت پر قناعت کرلو، جو اپنے رب کو اس کی رضا جوئی میں صبح و شام پکارتے ہیں۔ تمہاری نگاہیں دنیوی زندگی کی آرائش کی خاطر ان کی طرف سے پھرنے نہ پائیں ۴۴۔ اور ایسے شخص کی بات نہ مانو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑ گیا ہے اور جس کا معاملہ حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ ۴۵

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ ۚ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ یَشْوِی الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾

۲۹ اور کہو یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، تو جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے ۴۶۔ ہم نے ظالموں کے لئے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتوں نے انہیں گھیر لیا ہے ۴۷۔ اگر وہ پانی کے لئے فریاد کریں گے تو انہیں ایسا پانی دیا جائے گا جو پگھلی ہوئی دھات کی طرح ہوگا۔ اور ان کا منہ بھون ڈالے گا۔ کیا ہی بُری ہے پینے کی چیز اور کیا ہی بُری ہے آرام گاہ!

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾

۳۰ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے تو ہم نیک عمل کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے۔

۳۷۔ یعنی وثوق کے ساتھ یہ بات نہ کہو کہ میں فلاں کام کل کر دوں گا۔ تمہیں کیا معلوم کہ کل کیا صورت پیش آئے گی۔ اور تمہارے لئے اس کام کو انجام دینا ممکن ہوگا یا نہیں اس لئے تمہیں ایسے موقع پر انشاء اللہ کہہ دینا چاہئے جس کے معنیٰ ہیں ''اگر اللہ نے چاہا''۔ یہ استثناء اس بات کا اظہار ہے کہ اصل چیز اللہ کی مشیت ہے نہ کہ میرا اپنا فیصلہ، اگر اس کی مشیت ہوئی تو میں فلاں کام کر سکوں گا ورنہ نہیں، اسی لئے ایک مؤمن کا شعار یہ ہے کہ جب وہ کوئی وعدہ کرتا ہے یا کسی کام کے آئندہ کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے تو انشاء اللہ ضرور کہتا ہے۔

یہ تو ہوا آیت کا عمومی پہلو، رہا سلسلۂ بیان کے لحاظ سے خاص پہلو، تو یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ اگر لوگ کوئی سوال کریں جس کا جواب وحی الٰہی پر موقوف ہو تو یہ نہ کہو کہ کل میں اس کا جواب دوں گا۔ اِلّا یہ کہ ساتھ ہی یہ کہو اللہ نے چاہا تو۔

۳۸۔ یعنی اگر تم انشاء اللہ کہنا بھول جاؤ تو جب تمہیں یہ بات یاد آجائے، اس وقت اپنے رب کو یاد کرو تا کہ جو بھول ہوگئی تھی اس کی تلافی ہو جائے۔

۳۹۔ یعنی اصحاب کہف پر جس طرح اس نے رشد کی راہیں کھولیں، امید ہے کہ اس سے بھی زیادہ رشد کی راہیں وہ مجھ پر کھولے گا۔ یہ جواب ہے مشرکین مکہ کو کہ تم نے ظلم و جبر کا طریقہ اختیار کر کے وہی حالات پیدا کر دیئے ہیں، جو اصحاب کہف کے لئے ان کی قوم نے پیدا کر دئے تھے۔ لیکن میرا رب اس مرحلہ میں میرے لئے ان سے بھی زیادہ کامیابی کی راہیں کھولے گا۔ یہ اشارہ تھا اس بات کی طرف کہ عنقریب ہجرت کا معاملہ پیش آنے والا ہے، چنانچہ کچھ ہی دنوں بعد یہ مرحلہ سامنے آ گیا، اور آپ غار ثور میں پناہ لینے کے لئے مجبور ہو گئے۔ مگر غار میں آپ کو صرف تین دن گذارنا پڑے۔ اس کے بعد جب آپ مدینہ پہنچے ہیں تو کامیابی کی راہیں آپ پر کھلتی چلی گئیں۔

۴۰۔ یہ فقرہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اوپر تین سو نو سال کی مدت کا جو ذکر ہوا وہ لوگوں کا قول ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پیش کیا ہے۔ اوپر آیت ۲۲ میں تعداد کے بارے میں لوگوں کے مختلف اقوال کا ذکر ہوا تھا۔ درمیان میں جملہ معترضہ آیا۔ اب پھر اسی سلسلۂ بیان میں اصحاب کہف کے غار میں پڑے رہنے کی مدت کے بارے میں لوگوں کا قول نقل کیا گیا کہ وہ تین سو نو سال بتاتے ہیں۔ مگر اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے جتنی مدت بھی رہے اللہ بہتر جانتا ہے۔

اسی قصہ کے آغاز میں اللہ تعالیٰ یہ واضح فرما چکا ہے کہ وہ غار میں سالہا سال تک رہے (آیت ۱۱)۔ یعنی وہ ایک طویل مدت تک غار میں سوتے پڑے رہے اور اتنی بات سبق آموزی کے لئے کافی ہے۔

اصحاب کہف کے تعلق سے بعض مفسرین نے کرامت کی بحث چھیڑ دی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے ذریعہ کسی غیر معمولی (خارق عادت) واقعہ کو ظہور میں لاتا ہے یہ ایک حقیقت ہے جس کی مثال اصحاب کہف کا واقعہ بھی ہے اور حضرت مریم کا واقعہ بھی۔ یہ واقعات اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت کی دلیل ہیں۔ اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ کائنات پر اسی کی حکومت ہے، وہ جب چاہے قوانین طبعی میں تبدیلی لا سکتا ہے۔ رہیں وہ شخصیتیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کسی غیر معمولی واقعہ کو ظہور میں لاتا ہے، تو یہ واقعات ان کے نیک ہونے کی علامت ضرور ہیں۔ جن کی بنا پر ان کو یہ کرامت یعنی اعزاز بخشا گیا لیکن ان واقعات کو ظہور میں لانے میں ان کا اپنا دخل نہیں ہے۔ یعنی وہ اس معاملہ میں بالکل بے اختیار ہیں۔ کوئی کرامت وہ دعوے کے ساتھ دکھا نہیں سکتے۔ جب کہ ایک رسول اللہ کے اذن سے دعوے کے ساتھ معجزہ دکھاتا ہے، اسی لئے معجزہ اللہ کی کھلی حجت ہے۔ غرضیکہ کرامت کے بارے میں لوگوں کا یہ تصور کہ اولیاء اور بزرگانِ دین کرامتیں دکھاتے ہیں سراسر غلط ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی کسی خاص مصلحت سے کسی نیک شخص کے ذریعہ کسی غیر معمولی واقعہ کو ظہور میں لاتا ہے۔ ایسے واقعات شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں اور بعض اوقات اس شخصیت کو اس بات کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس کے ذریعہ کوئی کرامت ظاہر ہو رہی ہے چنانچہ اصحاب کہف ایک طویل مدت تک سوتے رہے مگر ان کو اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ ان کے ذریعہ کوئی کرامت ظہور میں آ رہی ہے، اور جب وہ جاگے ہیں تو اپنے سونے کی مدت کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکے۔ پھر انہوں نے کرامت کیا دکھائی؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کی نشانی تھی جو ان کے ذریعہ ظاہر ہوئی۔ یہی ان کیلئے شرف اور کرامت ہے۔

واضح رہے کہ مسلمانوں میں اولیاء اور پیروں کی جو کرامتیں مشہور ہیں، وہ زیادہ تر ان شخصیتوں سے غیر معمولی عقیدت پیدا کرنے کے لئے غلو پسند طبیعتوں نے گھڑی ہیں، حقیقت سے ان کا دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ ان بے سروپا قصوں نے مسلمانوں میں اولیاء پرستی کا ذہن پیدا کر دیا ہے۔

۴۱؎ متن میں لفظ ''حکم'' استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ فیصلہ کے بھی ہیں، اور ان اختیارات کے بھی، جن کے تحت فیصلے اور احکام صادر کئے جاتے ہیں۔ اللہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا، کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اختیارات میں اس نے کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا ہے۔ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ خدائی کے اختیارات ایک اللہ ہی کیلئے ہیں، جب کہ شرک کا فلسفہ یہ ہے کہ خدائی کے اختیارات میں دوسرے بھی شریک ہیں۔ جو شرک مسلمانوں میں اولیاء پرستی کی راہ سے آیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے خود ہی اپنے کچھ اختیارات اولیاء کو عطا کئے ہیں۔ اس شرک پر چونکہ اولیاء کی عقیدت کا لیبل لگا ہوا ہے اس لئے مسلمان آسانی سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اس عقیدہ کے باطل ہونے کیلئے یہ ایک آیت ہی کافی ہے جس میں واضح طور پر بیان کیا گیا کہ اللہ اپنے اختیارات میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

۴۲؎ قرآن سنانے کا یہ حکم عمومیت کے ساتھ دیا گیا ہے یعنی مقصود صرف مسلمانوں کو سنانا نہیں، بلکہ عام انسانوں کو سنانا ہے جو بھی قرآن سننے کیلئے آمادہ ہو۔

عربوں کی زبان عربی تھی اور قرآن عربی زبان میں ہے اس لئے ان کو قرآن سنانا، اللہ کے پیغام کو ان کی زبان میں ان تک پہنچانے کے ہم معنیٰ تھا۔ اب جب کہ امت مسلمہ کو غیر عربی داں قوموں سے واسطہ ہے قرآن کو اس کے معنیٰ و مفہوم کے ساتھ ان کی زبان میں پہنچانا ہوگا۔ اسی صورت میں ان پر قرآن کی حجت قائم ہو سکے گی اور اللہ نے چاہا تو کتنوں ہی کو ہدایت بھی نصیب ہوگی۔

۴۳؎ یعنی کوئی ایسی طاقت نہیں جو اللہ کے فرمانوں کو بدل سکتی ہو۔ اس کا ہر حکم اٹل، ہر فیصلہ نافذ العمل اور ہر وعدہ پورا ہو کر رہنے والا ہے۔ لہٰذا تم لوگوں کی خیریت اسی میں ہے کہ اس کے کلام میں کسی تبدیلی کی خواہش کرنے کے بجائے، اپنے آپ کو بدل دو اور اس سانچہ میں ڈھال لو جس سانچے میں کہ وہ تمہیں ڈھالنا چاہتا ہے۔

۴۴؎ جن لوگوں نے ایمان لا کر نبی ﷺ کی صحبت اختیار کر لی تھی، ان میں بیشتر ایسے تھے جو نہ مالی وسائل رکھتے تھے اور نہ اثر و رسوخ۔ مگر انہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایتِ ایمان سے نوازا تھا اس لئے ان کی زندگیاں رضائے الٰہی کی طلب میں بسر ہو رہی تھیں۔ دنیا پرست لوگ ان کو حقیر خیال کرتے تھے۔ مگر وہ تھے قیمتی ہیرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ ان کی پوری پوری قدردانی کی جائے، اور ان کی رفاقت کو اپنے لئے کافی خیال کر لیا جائے۔ ایسا ہرگز نہ ہو کہ ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر ان لوگوں کو اہمیت دینے لگو جو مال و دولت اور دنیوی شان و شوکت کے مالک ہیں، مگر اپنے رب سے غافل ہیں۔

اس آیت میں خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر مقصود، منکرین پر یہ واضح کرنا ہے کہ تمہیں اپنی شان و شوکت پر فخر ہے اور تم مخلص اہل ایمان کو حقیر خیال کرتے ہو۔ مگر اللہ کی نظر میں قدر کے حقیقی مستحق تم نہیں بلکہ اس کے یہ مخلص بندے ہیں۔

اسلام نے نماز باجماعت کا جو طریقہ رائج کیا ہے اس کی ایک اہم مصلحت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کی رفاقت میسر آئے۔ اور ان کا یہ اجتماع عبادت الٰہی کا اجتماع ہو اور ان کی یہ مجلس ذکر الٰہی کی مجلس ہو۔

۴۵؎ جب آدمی خدا کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو اس کی یاد سے غافل کر دیتا ہے۔ اور جب خدا کی یاد سے آدمی غافل ہو جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ اور جب خواہشات اس پر مسلط ہو جاتی ہیں تو معاملات میں بے اعتدالی اور افراط و تفریط کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ عقل و فطرت کی رہنمائی سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور شریعت کی رہنمائی سے بھی۔

ایسے لوگوں کی اطاعت نہ کرے (ان کے کہنے پر نہ چلنے) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی رہنمائی کے مقابلہ میں ان کی رہنمائی کو، اور اسکے احکام کے مقابلہ میں ان کے کسی حکم کو قبول نہ کیا جائے۔

اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی واضح ہوئی کہ ذکر الٰہی کا تعلق اصلاً دل سے ہے۔ اور دل کسی حال میں اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔

۴۶۔ یہ اور اس قسم کی دوسری آیتیں اس باب میں صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان اور کفر کے معاملہ میں انسان پر جبر نہیں کیا ہے۔ بلکہ اسے اختیار دیکر اس کی فہمائش کا سامان کیا ہے۔ اب وہ جس راہ کو چاہے اختیار کرے، اپنے بھلے بُرے کا وہ خود ذمہ دار ہے۔

۴۷۔ یہاں ظالم سے مراد وہی خدا سے غافل لوگ ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا۔ اور آگ کی قناتوں سے مراد جہنم کی لپیٹیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جہنم کی زد میں آچکے ہیں اور اس سے کسی طرح بچ نہیں سکتے۔

سورج زمین سے کروڑ ہا میل کے فاصلہ پر ہے مگر اس کی حرارت زمین پر برابر پہنچتی ہے۔ اور اگر اس کی کشش زمین کو اپنی طرف کھینچ لے تو زمین آگ کا گولہ بن جائے۔ جب مادی دنیا کا یہ حال ہے تو جو دنیا ہماری نظروں سے اوجھل ہے اس کی آگ کا یہ حال ہرگز قابل تعجب نہیں ہے، کہ اس کی تپش اس دنیا میں منکرین تک پہنچ رہی ہے۔ اور یہی وہ تپش ہے جو ان کے اخلاق و کردار کو خاکستر بنا رہی ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۚ﴿۳۱﴾

۳۱ ان کیلئے ہمیشگی کے باغ ہیں جن کے تلے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہاں ان کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور وہ باریک اور دبیز ریشم کے سبز کپڑے پہنیں گے ۴۸۔ اور تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ کیا ہی اچھا صلہ ہے اور کیا ہی اچھی آرام گاہ!

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ؕ﴿۳۲﴾

۳۲ ان لوگوں کو دو شخصوں کا حال سناؤ ۴۹۔ ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دئے اور ان کے گرد کھجور کے درخت لگائے اور ان کے درمیان میں کھیتی لگائی۔ ۵۰۔

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۙ﴿۳۳﴾

۳۳ دونوں باغ خوب پھلے اور اس میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ہم نے ان کے اندر نہر بھی جاری کر دی تھی۔

وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾

۳۴ اور (ان باغوں میں) اس کیلئے خوب پھل لگے تو اس نے اپنے ساتھی سے بات کرتے ہوئے کہا میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور میرا جتھا بھی زیادہ طاقتور ہے۔ ۵۱۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۙ﴿۳۵﴾

۳۵ پھر وہ اپنے باغ میں اس حال میں داخل ہو کر اپنے نفس پر ظلم کر رہا تھا۔ اس نے کہا میں نہیں سمجھتا کہ یہ کبھی تباہ ہو جائے گا۔ ۵۲۔

وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۚ﴿۳۶﴾

۳۶ اور نہ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ قیامت قائم ہو گی۔ اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف لوٹایا ہی گیا تو میں اس سے بہتر جگہ پاؤں گا۔ ۵۳۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ؕ﴿۳۷﴾

۳۷ اس کے ساتھی نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کیا تو کفر کرتا ہے اس سے جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر تجھے ٹھیک ٹھاک آدمی بنا دیا۔ ۵۴۔

لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾

۳۸ لیکن میں کہتا ہوں اللہ ہی میرا رب ہے۔ اور میں اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ ۵۵۔

وَلَوْلَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ۚ﴿۳۹﴾

۳۹ اور جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو کیوں نہ کہا مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ اللہ کی توفیق کے بغیر کسی کا کوئی زور نہیں) ۵۶۔ اگر تو دیکھ رہا ہے کہ میں مال اور اولاد میں تجھ سے کمتر ہوں۔

۴۸۔ جنت کے ماحول کو دنیا پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں کی زندگی شاہانہ ٹھاٹھ باٹ کی زندگی ہوگی اس لئے مردوں کو سونے کے کنگن بھی پہنائے جائیں گے اور ریشم کے کپڑے بھی۔

سبز رنگ خوشنما بھی ہوتا ہے اور آنکھوں کے لئے ٹھنڈک کا باعث بھی۔ اس لئے اس رنگ کا انتخاب نہایت موزوں انتخاب ہے اور ان باتوں کے اسرار تو جنت ہی میں کھلیں گے۔

۴۹۔ یہ کوئی فرضی مثال نہیں بلکہ سچا واقعہ ہے جو عبرت کے لئے بیان کر دیا گیا ہے۔ آگے آیت ۳۴ اور ۳۷ میں صراحت ہے کہ دو اشخاص کے درمیان گفتگو ہوئی تھی، جو اس مثال کے واقعاتی مثال ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

۵۰۔ یعنی اس شخص کو اللہ تعالیٰ کی نوازش اس طرح ہوئی تھی، کہ اس نے ایک چھوڑ دو باغ عطا کئے تھے اور یہ باغ اعلیٰ قسم کے تھے۔ عربوں کے ہاں اعلیٰ قسم کا باغ انگوروں کو ہوتا تھا جس کے گرد کھجور کے درخت ہوتے، تاکہ تیز و تند ہوا سے انگور کی بیلیں محفوظ رہ سکیں۔ اور درمیانی حصہ میں کھیتی ہوتی جس سے غلہ حاصل ہوتا۔

۵۱۔ یہ اس کی فخریہ باتیں تھیں۔ اور جو غرور اس کے دل میں تھا وہ دوران گفتگو ظاہر ہو گیا۔

۵۲۔ جب وسائل کی فراوانی کسی کو حاصل ہوتی ہے تو وہ دولت کے نشے میں یہ خیال کرنے لگتا ہے، کہ کم از کم میری زندگی میں اس پر زوال آنے والا نہیں ہے۔ مالداروں کی یہی نفسیات ہوتی ہے اور یہ اطمینان انہیں خدا سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

۵۳۔ یعنی اول تو قیامت قائم ہوگی نہیں اور اگر ہوئی تو جس طرح دنیا میں نوازا گیا ہوں اسی طرح آخرت میں بھی نوازا جاؤں گا۔ یہ دولت مندوں کی ذہنیت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں ان کو جو دولت ملی ہے وہ آزمائش کے طور پر نہیں، بلکہ اس لئے ملی کہ وہ اسی کے مستحق تھے۔ اور جب وہ دنیا میں اس کے مستحق ہوئے تو آخرت میں کس طرح مستحق نہیں ہوں گے۔

۵۴۔ اس کے ساتھی نے جو مؤمن تھا اس کو فہمائش کی۔ اس کی فخریہ اور متکبرانہ باتوں کو صریح کفر قرار دیا۔ اسے دعوت فکر دی کہ جس ہستی نے اپنے کرشمۂ قدرت سے مٹی سے انسان پیدا کیا، پھر پانی کی حقیر بوند سے اس کی نسل کا سلسلہ چلایا اور پھر تجھے مکمل انسان بنا کر کھڑا کیا اس کا تو ناشکرا بنتا ہے؟

اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ ایک مؤمن دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تذکیر کے معاملے میں موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کی گفتگو اس سے خالی نہیں ہوتی۔ اسے اپنے ساتھی کی اصلاح کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ اور وہ بات بات میں بڑے پتہ کی بات کہہ جاتا ہے۔

۵۵۔ یہ توحید کا اعلان اور شرک کی نفی تھی۔

۵۶۔ یعنی باغ کو دیکھ کر تجھے اپنی بڑائی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ بلکہ اللہ کے فضل کا اعتراف کرنا چاہئے تھا، نیز اس بات کا اقرار و اظہار کہ اس کی کسی نعمت سے فائدہ اٹھانا اسی کی مدد پر موقوف ہے۔ نہ میرا اپنا بل بوتا ہے کہ اس سے فائدہ اٹھا سکوں، اور نہ کوئی اور طاقت ایسی ہے جو مجھے فائدے پہنچا سکتی ہے۔

اس آیت میں یہ تعلیم مضمر ہے کہ آدمی جب اپنے باغ، کھیت، کارخانہ وغیرہ میں داخل ہو تو پیداوار کے پرکشش منظر کو دیکھ کر اپنے رب کا شکر ادا کرے اور اس پر توکل کا اظہار کرے۔ اس مقصد کے لئے ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ کے کلمات نہایت موزوں ہیں۔

فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾

۴۰ تو کیا عجب کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا فرمائے۔۵۷؎ اور تیرے باغ پر آسمان سے کوئی ایسی آفت نازل کرے کہ وہ چٹیل میدان بن کر رہ جائے۔۵۸؎

اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾

۴۱ یا اس کا پانی نیچے اتر جائے اور تو اسے حاصل نہ کر سکے۔۵۹؎

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾

۴۲ پھر اس کے پھل گھیرے میں آ گئے اور وہ اپنے اس مال پر جو اس نے خرچ کیا تھا ہاتھ ملتا رہ گیا، جب کہ باغ ٹٹیوں پر گرا پڑا تھا۔ کہنے لگا کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ! ۶۰؎

وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾

۴۳ (تو دیکھو) کوئی جتھا ایسا نہ ہوا جو اللہ کے مقابلہ میں اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود (اس آفت کا) مقابلہ کر سکا۔۶۱؎

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾

۴۴ اس وقت یہ بات کھل گئی کہ سارا اختیار اللہ برحق ہی کیلئے ہے۔ وہ جزا دینے کے لحاظ سے بھی بہتر ہے اور عاقبت کے لحاظ سے بھی بہتر۔۶۲؎

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾

۴۵ اور انہیں دنیا کی زندگی کی مثال سناؤ۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ پانی جو ہم نے آسمان سے برسایا جس سے زمین کی نباتات خوب گھنی ہو گئیں، پھر وہ چورا چورا ہو کر رہ گئیں جس کو ہوائیں اڑائے لئے پھرتی ہیں۶۳؎۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔۶۴؎

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

۴۶ مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی زینت ہیں۔ اور باقی رہنے والے نیک عمل تمہارے رب کے نزدیک اجر کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے بھی۔۶۵؎

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾

۴۷ وہ دن کہ ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور تم دیکھو گے کہ زمین بالکل بے نقاب ہو گئی ہے۶۶؎۔ اور لوگوں کو ہم اکٹھا کریں گے، کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔۶۷؎

وَعُرِضُوْا عَلٰي رَبِّكَ صَفًّا ۭ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾

۴۸ اور سب تمہارے رب کے حضور صف در صف پیش کئے جائیں گے ۶۸؎۔ آ گئے تم ہمارے پاس اسی طرح جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ تم نے تو یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تمہاری پیشی کے لئے کوئی وقت مقرر ہی نہیں کیا ہے۔۶۹؎

۵۷۔ یعنی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے بہتر نعمت عطا فرمائے گا۔اس میں اشارہ ہے آخرت کی جنت کی طرف جس کے مقابلہ میں دنیوی باغ کوئی وقعت نہیں رکھتے۔

۵۸۔ یعنی اپنے باغ پر اتنا ناز نہ کر۔خدا سے ڈر کہ وہ کوئی آسمانی آفت نازل کر کے تیرے باغ کو تہس نہس کر سکتا ہے۔

۵۹۔ یعنی اس بات کا بھی تو امکان ہے کہ نہر کا پانی زمین کے اندر چلا جائے۔مطلب یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی حادثہ ایسا پیش آ سکتا ہے جو باغ کی ویرانی کا سبب بن جائے۔

۶۰۔ بندہ مؤمن کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔چنانچہ باغ پر ایسی آفت آئی کہ وہ ڈھیر ہو کر رہ گیا۔جب اس کافر نے تباہی کے اس منظر کو دیکھا تو کف افسوس ملتا رہ گیا۔اس وقت اسے اپنی غلط ذہنیت کا احساس ہوا اور یہ بات اس پر کھل گئی کہ توحید کا عقیدہ ہی صحیح عقیدہ ہے۔اس لئے وہ اس شرک پر پچھتایا جس میں وہ مبتلا تھا۔

۶۱۔ جب اللہ نے اس کے باغ کو تباہ کرنا چاہا،تو نہ وہ جتھا اس کافر کے کام آیا جس پر وہ فخر کرتا تھا۔اور نہ اس کے ٹھہرائے ہوئے شریک اس کی مدد کو پہنچ سکے،اور نہ ہی اس کے اندر یہ بل بوتا تھا کہ وہ خود اس آفت کا مقابلہ کرتا۔

۶۲۔ یعنی اس واقعہ سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ سارے اختیارات اللہ ہی کے پاس ہیں جو حقیقی رب ہے۔اور اس کے اختیارات میں کوئی شریک نہیں۔نفع و نقصان کا پہنچنا سب اسی کے چاہنے پر موقوف ہے۔لہٰذا انعام اور اجر اسی سے طلب کیا جائے،اور امیدیں بھی اسی سے وابستہ کی جائیں۔

اس رہنمائی کے علاوہ اس واقعہ سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں،اور اس کی دعوت دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں،وہ ہوسکتا ہے مادی وسائل کے لحاظ سے کوئی مقام نہ رکھتے ہوں۔لیکن انجام ان ہی کا بخیر ہونے والا ہے۔کفر کرنے اور اپنی دولت پر گھمنڈ کرنے والوں کو بالآخر پچھتانا ہی پڑے گا۔

۶۳۔ اس مثال میں حیات دنیا کی بہار کو زمین کی بہار سے تشبیہ دی گئی ہے۔بارش ہونے پر زمین کی روئیدگی ابھر آتی ہے اور وہ سرسبز ہو جاتی ہے مگر اس کی یہ رونق عارضی ہوتی ہے۔چند دنوں کے بعد اس کا رنگ بھی بدل جاتا ہے۔اور وہ چورا چورا ہو کر رہ جاتی ہے پھر ہوا کے جھونکے اس کو اڑا دیتے ہیں۔اس طرح زمین کی یہ رونق خاک میں مل جاتی ہے۔دنیوی زندگی کا بھی یہی حال ہے۔اس کی بہار چند روزہ ہے اس کے بعد اس پر خزاں آنے والی ہے جو اس کی ساری دلفریبیوں کو ختم کر کے رکھ دے گی۔لہٰذا جو لوگ دنیوی زندگی کو مقصود بناتے ہیں ان کے حصہ میں خزاں ہی آنے والی ہے۔

واضح رہے کہ دنیا کو مقصد بنا کر زندگی بسر کرنے اور آخرت کو مقصد بنا کر زندگی بسر کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔یہاں جس کو مذموم قرار دیا گیا ہے وہ پہلی چیز ہے۔

۶۴۔ یعنی اللہ جس طرح بہار لانے پر قادر ہے اسی طرح خزاں لانے پر بھی قادر ہے۔وہ زمین پر ایسی خزاں لا سکتا ہے کہ اس کی موجودہ رونق ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

۶۵۔ مال اور اولاد اللہ کی نعمتوں میں سے ہیں۔لیکن آدمی جب ان کی ظاہری کشش سے اتنا متاثر ہو جائے کہ ان ہی کا ہو کر رہ جائے،اور آخرت کو پس پشت ڈال دے،تو یہ مقصدِ زندگی ہی سے انحراف ہے۔اس لئے قرآن اس ذہنیت پر ضرب لگاتا ہے۔اور جو بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ جو چیز مرنے کے بعد اور دنیا کے درہم برہم ہو جانے کے بعد بھی باقی رہنے والی ہے وہ نیک اعمال ہی ہیں۔ان ہی کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے ہاں بندہ اجر کا مستحق قرار پائے گا اور اسی بنیاد پر وہ اپنے رب سے اس کے فضل و کرم کی امید وابستہ کر سکتا ہے۔لہٰذا آدمی کی سعی و جہد کا رخ یہ ہونا چاہئے کہ اس کی زندگی نیک عملی کی زندگی ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمائے۔مال اور اولاد کے معاملہ میں انسان کو وہی رویہ اختیار کرنا چاہئے جو اس کی نیکیوں میں اضافہ کا باعث ہو۔

۶۶؎ یعنی قیامت کی گھڑی جب آئے گی تو زمین کی ہیئت اور اس کے موجودہ نظام میں عظیم تبدیلیاں واقع ہوں گی۔ کوئی پہاڑ خواہ وہ ہمالیہ ہی کیوں نہ ہو اپنی جگہ پر رہ نہیں سکے گا، بلکہ سب پہاڑ ہوا میں اڑنے لگیں گے اور جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ صراحت ہے ریزہ ریزہ ہو کر رہ جائیں گے۔ اور جب پہاڑوں کا یہ حال ہوگا تو انسانوں کے بنائے ہوئے مکان، اونچی عمارتیں اور محل کہاں باقی رہ سکیں گے۔ سب ختم ہو جائیں گے اور زمین ایک کھلے میدان کی شکل میں ظاہر ہوگی۔

۶۷؎ یعنی نوع انسانی کے تمام افراد جو آدم سے لے کر قیامت تک پیدا ہوتے اور مرتے رہیں گے، ان سب کو قیامت کے دن دوبارہ زندہ کر کے میدان حشر میں اکٹھا کیا جائے گا۔ شاہ ہو یا گدا، امیر ہو یا غریب اور مؤمن ہو یا کافر کسی استثناء کے بغیر سب کو حاضر کر دیا جائے گا۔

۶۸؎ اس وقت خدا کے حضور ان کی پیشی ہوگی، تاکہ وہ دنیا میں جو کچھ کرتے رہے ہیں اس کی جوابدہی کریں۔ یہ پیشی نظم و انضباط کے ساتھ ہوگی۔ چنانچہ انہیں صف در صف کھڑا کر دیا جائے گا کہ وہ فرمانروائے کائنات کی عدالت میں حاضر ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور نماز کی صفیں اسی صف بندی کی مثال ہیں۔

۶۹؎ جب لوگ خدا کے حضور صف بہ صف پیش ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا، کہ دوسری مرتبہ پیدا کرنے کی جو خبر ہم نے تمہیں دی تھی وہ آج حرف بہ حرف پوری ہوگئی۔ مگر تم لوگوں نے۔۔۔۔۔ منکرین آخرت نے۔۔۔۔۔۔ یہ خیال کر رکھا تھا کہ ہمارے حضور پیشی ہونا ہی نہیں ہے۔ ہم نے نہ اس کا وعدہ کیا ہے اور نہ اس کے لئے وقت مقرر کیا۔ آج تمہیں معلوم ہو گیا کہ تمہارا یہ خیال خیالِ خام تھا۔ اور حق وہی تھا جس کی خبر ہم نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعے دی تھی۔

❑❑❑❑❑❑

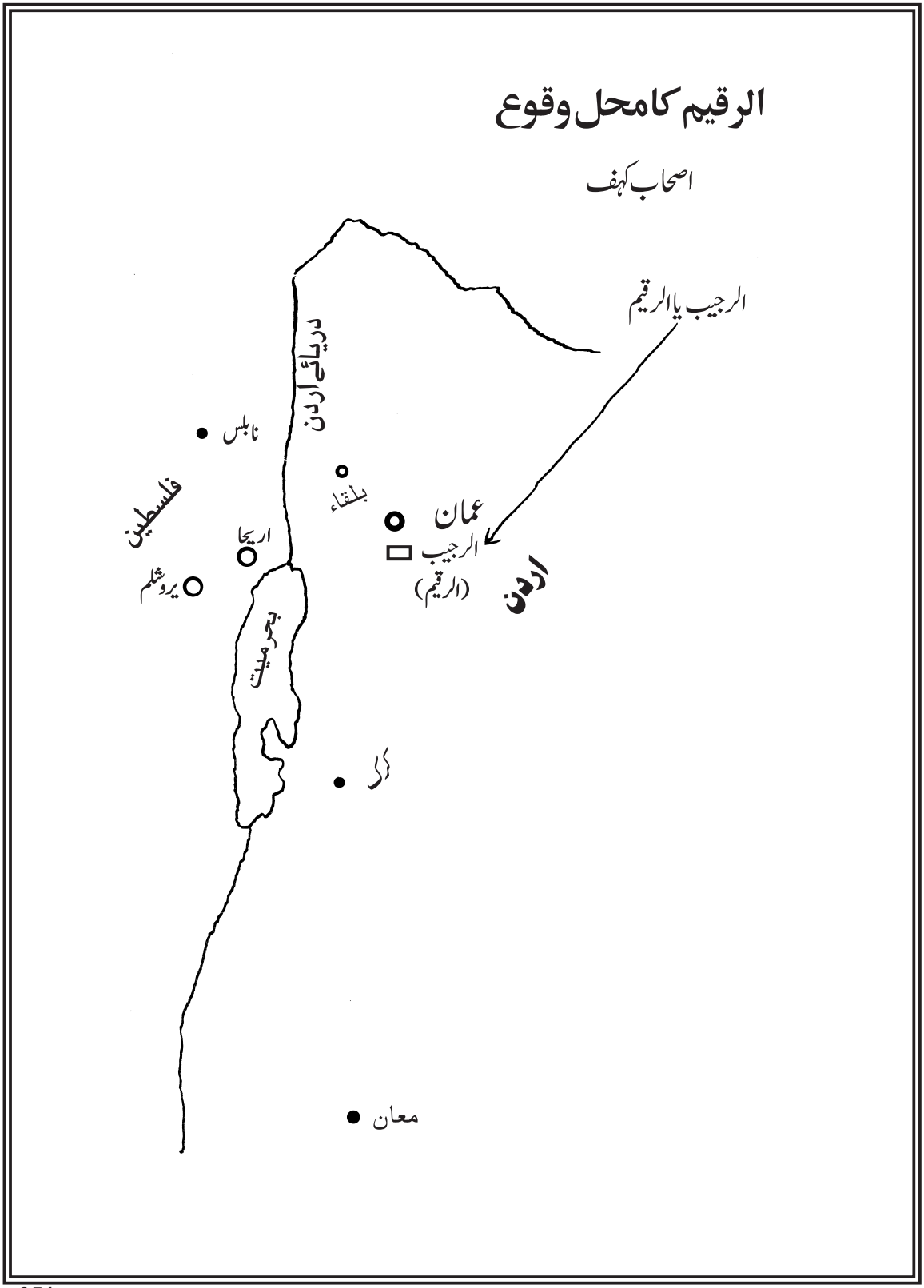

الرقیم کا محل وقوع

اصحاب کہف

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝۴۹

۴۹ اور نامۂ عمل (سامنے) رکھ دیا جائے گا تو تم دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں درج ہوگا اس سے مجرم ڈر رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے ہماری شامت! یہ کیسا نوشتہ ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی بات ایسی نہیں جو اس نے درج نہ کر لی ہو ۷۰؎ ۔اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب حاضر پائیں گے۔اور تمہارا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ ۷۱؎

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝۵۰

۵۰ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہیں کیا ۷۲؎ ۔وہ جنوں میں سے تھا۔ ۷۳؎ تو اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ پھر کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی نسل کو، ۷۴؎ اپنا کارساز بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔کیا ہی برا بدل ہے ظالموں کے لئے! ۷۵؎

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ۝۵۱

۵۱ میں نے ان کو آسمان اور زمین کے پیدا کرتے وقت نہیں بلایا تھا۔اور نہ خود ان کے پیدا کرتے وقت بلایا تھا۔اور میرا یہ کام نہیں کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو بناؤں۔ ۷۶؎

وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَاۗءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ۝۵۲

۵۲ جس دن وہ فرمائے گا کہ بلاؤ ان کو جن کو تم میرا شریک سمجھ بیٹھے تھے تو وہ ان کو پکاریں گے مگر وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے اور ہم ان کے درمیان ایک ہلاکت کا گڑھا حائل کر دیں گے۔ ۷۷؎

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ۝۵۳

۵۳ اور مجرم آگ کو دیکھ لیں گے اور سمجھ جائیں گے کہ انہیں اس میں گرنا ہے۔وہ اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝۵۴

۵۴ اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر طرح کی مثالیں بیان کر دیں ۷۸؎ ۔مگر انسان بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ ۷۹؎

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَاۗءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۝۵۵

۵۵ اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آ گئی تو اس پر ایمان لانے اور اپنے رب سے معافی چاہنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہوئی۔سوائے اس کے کہ گذری ہوئی قوموں کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا تھا وہ ان کے ساتھ بھی پیش آ جائے یا عذاب ان کے سامنے نمودار ہو۔ ۸۰؎

۷۰۔ یعنی ہر شخص کے عمل کا ایسا ریکارڈ پیش کیا جائے گا، کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی درج ہونے سے رہ نہیں گیا ہوگا۔ اپنی عملی زندگی کا اتنا صحیح اور مکمل ریکارڈ دیکھ کر انسان حیرت میں پڑ جائے گا۔ کیوں کہ وہ آخرت کا انکار کرتا رہا ہے لہٰذا یہ ریکارڈ اس کے لئے غیر متوقع ہوگا۔

۷۱۔ یعنی نہ کسی کی حق تلفی ہوگی اور نہ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی۔ عدل وانصاف کے سارے تقاضے ہر ہر شخص کے حق میں پورے کئے جائیں گے۔

ان آیات میں عدالتِ خداوندی کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے اس کی مثال نہ بائبل میں موجود ہے اور نہ کہیں اور۔ یہ قرآن ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ قیامت اور آخرت کے احوال اتنی تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ یقین واطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ ان آیتوں میں خدا کے حضور پیشی کا جو مضمون بیان ہوا ہے وہ ایک شہ پارہ ہے، جو دل ودماغ کو بدلنے کے لئے بالکل کافی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ آخرت کا یہ عقیدہ مشرکینِ ہند کے آواگون (Transmigration) کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ اس نظریہ کی رو سے نہ قیامت برپا ہونا ہے، اور نہ خدا کے حضور حاضری کا کوئی سوال ہے اور نہ جوابدہی کا کوئی تصور۔

۷۲۔ اس کی تشریح سورہ بقرۃ نوٹ ۷۴، ۴۸ میں گذر چکی۔ یہاں آدم وابلیس کے قصہ کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ ابلیس انسان کا ازلی دشمن ہے۔ اس لئے وہ نہیں چاہتا کہ انسان دنیا کے امتحان میں کامیاب ہو کر جنت کا مستحق بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسان کو شرک میں مبتلا کرتا ہے تاکہ آخرت کو وہ کسی طرح مقصدِ حیات نہ بنائے۔

۷۳۔ یہ آیت صراحت کرتی ہے کہ ابلیس جنوں میں سے تھا۔ اسلئے وہ روایتیں قابل رد ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ فرشتوں میں سے تھا۔ ابن کثیر نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ اس بارے میں اکثر روایتیں اسرائیلیات میں سے ہیں۔ اور بعض روایتیں تو بالکل جھوٹی ہیں۔ (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۸۹)

قرآن نے فرشتوں کا وصف یہ بیان کیا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کی کبھی نافرمانی نہیں کرتے۔ ابلیس چونکہ جنوں میں سے تھا جو انسان کی طرح مکلف مخلوق ہے اس لئے وہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھا۔

۷۴۔ معلوم ہوا کہ ابلیس کی نسل بھی ہے اور اسکا پورا قبیلہ ہے۔

۷۵۔ مشرکین حقیقی خدا کو خدا کی حیثیت سے ماننے کے بجائے شیطان کو خدا کا مقام دینے لگتے ہیں۔ اس طرح خدا کو چھوڑ کر وہ شیطان کو خدا بنا لیتے ہیں۔ خدا کا کتنا بُرا بدل ہے جو ظالموں نے اپنے لئے تجویز کیا ہے۔

جہاں تک شیطان کے وجود کا تعلق ہے، قرآن اس کو شخصی وجود رکھنے والے اور جان بوجھ کر گمراہ کرنے اور شر پھیلانے والے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس لئے اس کی یہ تاویل کرنا کہ یہ محض شر کا نام ہے۔ اس کا کوئی شخصی وجود نہیں قرآن کے بیان کے سراسر خلاف ہے۔ شیطان سے آدم اور حوّا دونوں کو واسطہ پڑا تھا اس لئے نسلاً بعد نسلٍ اس کا تصور انسانوں میں منتقل ہوتا رہا۔ اور انبیاء علیہم السلام بھی شیطان کے شر سے بچنے کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔ اس لئے اس کا وجود لوگوں کے نزدیک مسلّم رہا ہے اور مشرکینِ عرب کو بھی اس کے وجود سے انکار نہیں تھا۔ اس کے وجود کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ انسانوں کی بہت بڑی اکثریت ہمیشہ شر میں مبتلا رہی ہے جیسا کہ تاریخ سے واضح ہے اور جس کا مشاہدہ آج بھی ہم کر رہے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد کا ہر دور میں بگاڑ میں مبتلا ہونا اور شر پر آمادہ ہونا صاف ظاہر کرتا ہے کہ خارج سے انسان کو ورغلانے کا کام ہو رہا ہے۔ یہ ورغلانے والی قوت انسان کی دشمن ہے، یہ قوت کوئی اندھی قوت نہیں، بلکہ مکر وفریب اور سازشوں کے ذریعہ انسان کو پھانسنے والی سرکش قوت ہے۔

۷۶۔ مشرکین عرب شیاطین کو اپنا دوست اور کارساز، ایک تو اس معنیٰ میں بناتے ہیں کہ اپنے نفس کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ ان کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ اور دوسرے اس معنیٰ میں کہ ان کو خدائی نظام میں دخیل سمجھ کر ان کے ضرر سے بچنے کیلئے ان کی پرستش کرتے ہیں، تاکہ وہ ان سے خوش رہے اور بلائیں ٹلتی رہیں۔ اس طرح انہوں نے شیطانوں کو بھی خدا کا شریک ٹھہرایا تھا اسی پر گرفت کرتے ہوئے یہاں فرمایا گیا ہے کہ خدا کے حقِ اطاعت و پرستش

میں شیطانوں کو شریک کرنے کا سوال ہی نہیں جب کہ ان کا خدائی نظام میں کوئی دخل نہیں ہے، نہ آسمان وزمین کی تخلیق میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان کی اپنی تخلیق میں۔ اللہ نے ان کو اپنی مدد کیلئے کبھی نہیں بلایا۔ اوّل تو یہ خیال ہی حماقت ہے کہ اللہ نے کسی کو اپنا مددگار بنایا ہے۔ اور مزید حماقت یہ سمجھنا کہ شیطانوں کو اس نے اپنا مددگار بنایا ہے۔ گویا خدا نے اپنے خدائی نظام کو چلانے کے لئے مددگار منتخب بھی کئے تو گمراہ کرنے والے شیاطین! نعوذ باللہ من ذلک۔

۷۷؎ یعنی قیامت کے دن ان مشرکین سے کہا جائے گا کہ جن کو تم نے خدا کا شریک سمجھ کر اپنا دوست اور کارساز بنالیا تھا، اُن کو اب اپنی مدد کے لئے بلالو، وہ ان کو بلائیں گے مگر وہ ان کو کوئی جواب نہیں دیں گے۔ اور دونوں کے درمیان تباہی کا گڑھا حائل کر دیا جائے گا، کہ نہ یہ پرستار اپنے معبودوں کے پاس پہنچ سکیں گے اور نہ ان کے معبود اپنے پرستاروں کے پاس پہنچ سکیں گے۔

۷۸؎ تشریح کے لئے دیکھئے سورہ بنی اسرائیل نوٹ ۱۲۲؎۔

۷۹؎ یعنی بجائے اس کے کہ وہ نصیحت پر دھیان دیتا بحث وجدال پر اتر آتا ہے اور یہ انسان کی عام کمزوری ہے۔

۸۰؎ یعنی واضح ہدایت آجانے کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس پر ایمان نہ لائیں۔ اور جس شرک میں وہ مبتلا رہے اس سے وہ اللہ کے حضور معافی نہ مانگیں۔ اگر وہ اس کے باوجود ایمان نہیں لاتے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ انہیں بھی ہلاکت کا وہی معاملہ پیش آجائے جو سابقہ امتوں کو پیش آیا تھا۔ یا پھر وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ عذاب کو ہم اپنے سامنے دیکھ لیں گے تو ایمان لائیں گے۔ لیکن اس وقت ایمان لانا بے سود ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی حجت ان پر قائم ہوگئی ہے اس کے بعد بھی اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو عذاب ہی ان کی آنکھیں کھول سکتا ہے۔

مجمع البحرین

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے ملنے کی امکانی جگہ

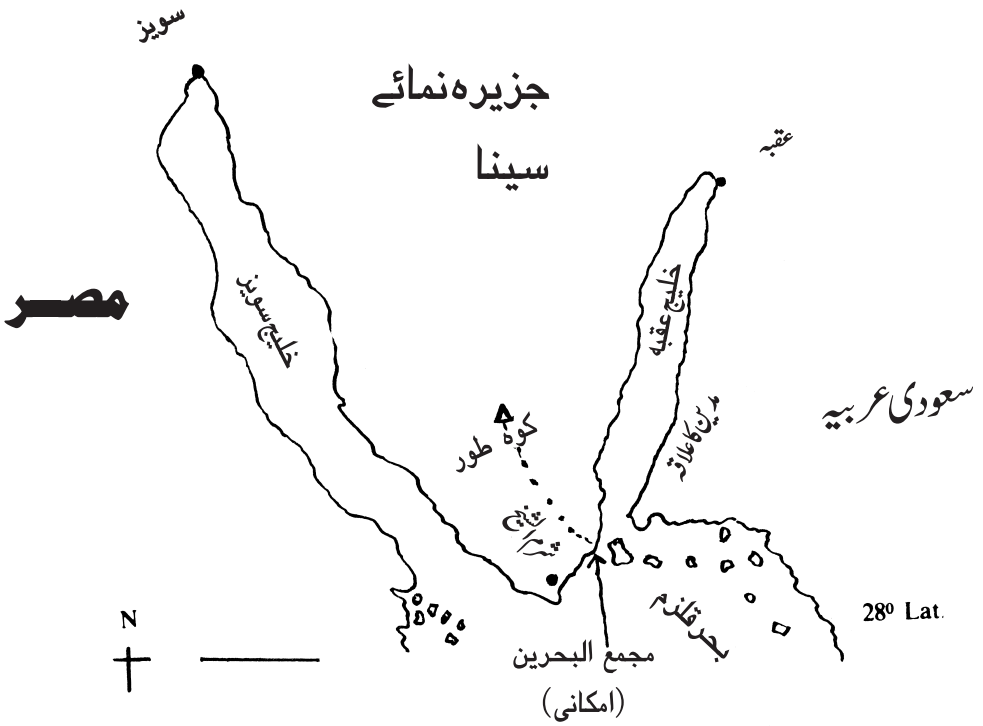

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾

۵۶ اور ہم رسولوں کو صرف اس لئے بھیجتے ہیں کہ وہ بشارت دیں اور خبردار کریں ۸۱۔ مگر کافر باطل کے سہارے جھگڑنے لگتے ہیں تاکہ حق کو شکست دیں ۸۲۔ انہوں نے میری آیتوں کو اور اس بات کو جس سے ان کو خبردار کیا گیا ہے، ۸۳۔ مذاق بنالیا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾

۵۷ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیتوں کے ذریعہ یاد دہانی کی جائے اور وہ ان سے منہ پھیر لے اور اپنے کرتوتوں کو بھول جائے؟ ایسے لوگوں کے دلوں پر ہم نے پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ کچھ نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے۔ ۸۴۔ تم انہیں ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ وہ کبھی ہدایت پانے والے نہیں ہیں۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِلًا ﴿۵۸﴾

۵۸ اور تمہارا رب بڑا بخشنے والا رحمت والا ہے۔ اگر وہ انکے کرتوتوں پر انہیں پکڑتا تو فوراً عذاب نازل کرتا۔ لیکن ان کیلئے ایک وقت مقرر ہے جس سے بچ کر پناہ لینے کی کوئی جگہ وہ نہ پائیں گے۔ ۸۵۔

وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾

۵۹ اور یہ بستیاں ہیں ۸۶۔ جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا جب کہ انہوں نے ظلم کیا۔ اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لئے وقت مقرر کر رکھا تھا۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾

۶۰ اور جب موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ میں چلتا رہوں گا یہاں تک کہ دو سمندروں کے ملنے کی جگہ پر پہنچ جاؤں خواہ مجھے کتنا ہی عرصہ گزارنا پڑے۔ ۸۷۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾

۶۱ پھر جب وہ دونوں کے ملنے کی جگہ پر پہنچ گئے تو انہیں اپنی مچھلی کا خیال نہ رہا اور اس نے سمندر میں جانے کیلئے سرنگ کی طرح راہ بنا لی۔ ۸۸۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَاۗءَنَا ۡ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾

۶۲ جب آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا لاؤ ہمارا کھانا۔ اس سفر سے تو ہمیں بڑی تکان ہوگئی۔ ۸۹۔

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۡ عَجَبًا ﴿۶۳﴾

۶۳ اس نے کہا آپ نے دیکھا نہیں جب ہم چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو مجھے مچھلی کا خیال نہ رہا اور یہ شیطان ہی ہے جس نے مجھے ایسا بھلاوے میں ڈال دیا کہ میں اس کا ذکر نہ کر سکا۔ اس نے سمندر میں جانے کی راہ عجیب طریقہ سے نکال لی۔ ۹۰۔

۸۱۔ یعنی رسولوں کا کام عذاب لانا نہیں بلکہ ایمان لانے والوں کو ابدی کامیابی کی خوش خبری سنانا، اور کفر کرنے والوں کو ابدی ہلاکت سے خبردار کرنا ہے۔

۸۲۔ یعنی جن لوگوں کو رسول کی بات ماننے سے انکار ہے وہ غلط اور نامعقول باتوں کا سہارا لے کر بحث کرنے لگتے ہیں۔ اور منصوبہ یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح حق کی شکست ہو اور وہ دب جائے۔

۸۳۔ یعنی عذاب کو جس سے انہیں خبردار کیا گیا ہے۔

۸۴۔ تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ انعام نوٹ۔ ۴۴۔

۸۵۔ یعنی ان منکرین کے کرتوت تو ایسے ہیں کہ اللہ کا عذاب ان پر فوراً نازل ہو جائے۔ مگر اللہ بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔ اسلئے وہ انہیں سنبھلنے کا موقع دے رہا ہے تاکہ وہ توبہ کر کے اسکی رحمت کے مستحق بن جائیں۔ مگر یہ مہلت ایک مقررہ وقت تک ہی کیلئے ہے۔ جب عذاب آجائے گا تو پھر انہیں کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔

۸۶۔ اشارہ ہے ان بستیوں کی طرف جن کی ہلاکتوں کا ذکر قرآن میں بار بار ہوا ہے۔

۸۷۔ فحوائے کلام (آیت کے مضمون) سے ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام، اللہ تعالیٰ سے اشارہ پا کر ایک خاص مہم پر روانہ ہو رہے تھے۔ اور وہ مہم یہ تھی کہ ایک مخصوص مقام پر اللہ کے ایک خاص بندہ سے ملاقات کر کے اس علم سے استفادہ کریں، جو دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کے اسرار و رموز سے متعلق اللہ نے اسے بخشا ہے۔ اس سفر میں انہوں نے اپنے خادم کو ساتھ لیا تھا اور چلتے وقت ان پر اپنے اس مصمم ارادہ کا اظہار کیا تھا، کہ اس سفر میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگ جائے بہر حال مجھے جاری رکھنا ہے۔ یہاں تک کہ مقررہ منزل تک پہنچ جاؤں۔ اور وہ منزل مجمع البحرین، دو سمندروں کے ملنے کی جگہ ہے۔

یہ کون سے دو سمندر ہیں اور وہ کہاں آکر ملتے ہیں اس کی صراحت قرآن نے نہیں کی۔ کیوں کہ اس واقعہ کو بیان کرنے کا جو مقصد قرآن کے پیش نظر ہے اس کے لحاظ سے یہ تفصیلات غیر ضروری تھیں۔ جہاں تک قرائن کا تعلق ہے موسیٰ علیہ السلام نے یہ سفر اس وقت کیا ہوگا جب کہ وہ سینا میں قیام پذیر تھے۔ اور بنی اسرائیل کو جہاد سے جی چرانے کے نتیجہ میں یہ سزا ملی تھی کہ وہ چالیس سال تک صحرائے سینا میں بادیہ پیمائی کرتے رہے۔ اس سے پہلے ان کو چھوڑ کر ان کا ایک طویل سفر پر جانا قرینِ قیاس نہیں اور نہ یہ بات قرین قیاس ہے کہ مصر میں قیام کے دوران انہوں نے یہ سفر کیا ہوگا۔ کیوں کہ اس وقت فرعون کو دعوت حق دینے، اس پر حجت قائم کرنے اور بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ سے آزاد کرانے جیسے اہم ترین فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھے۔ لہٰذا قرائن اسی کی تائید میں ہیں کہ سفر کا یہ واقعہ سینا میں قیام کے دوران پیش آیا ہوگا۔ اور اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مجمع البحرین سے مراد وہ جگہ ہے جہاں بحر قلزم اور خلیج عقبہ ملتے ہیں۔ یہ مقام جزیرہ نمائے سینا کے جنوب میں شرم الشیخ کے پاس ہے جہاں چھوٹے چھوٹے جزیرے بنے ہوئے ہیں۔ اور ان کے سامنے یعنی خلیج عقبہ کے دوسرے کنارے پر مدین کا علاقہ پڑتا ہے۔

۸۸۔ اس سفر کے سلسلے میں موسیٰ علیہ السلام کو یہ ہدایت ہوئی تھی کہ وہ مچھلی ساتھ لے لیں، جہاں مچھلی غائب ہو جائے وہی مقام ان کی اصل منزل ہوگا۔ یہ مچھلی ان کے خادم نے توشہ دان میں رکھ لی تھی۔ چونکہ اس کے ذریعہ منزل کی نشاندہی ہونے والی تھی۔ اس لئے اس معاملہ میں چوکنا رہنے کی ضرورت تھی۔ مگر دونوں کو اس کا خیال نہیں رہا۔ موسیٰ علیہ السلام تو آرام کر رہے تھے اور ان کے خادم نے مچھلی کو نیچے سے راہ نکال کر سمندر میں جاتے ہوئے دیکھا۔ لیکن بعد میں موسیٰ علیہ السلام سے اس کا ذکر کرنا بھول گئے۔ اور خود موسیٰ علیہ السلام کو بھی بیدار ہو جانے پر مچھلی کے بارے میں کچھ پوچھنے کا خیال نہیں رہا۔ مچھلی زندہ ہو کر توشہ دان سے سمندر میں چلی گئی تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرشمۂ قدرت تھا جو اس لئے ظہور میں آیا تھا کہ اپنے رسول کو منزل کا پتہ بتا دیا جائے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ اللہ کے لئے کسی بھی مُردہ چیز کو زندہ کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔

۸۹۔ پھر جب اس مقام کو چھوڑ کر وہ آگے بڑھے تو کچھ دور جانے کے بعد حضرت موسیٰ کو تکان کا احساس ہوا۔ چونکہ وہ منزل سے آگے بڑھ چکے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان پر تکان کی کیفیت طاری کر دی۔ اس وقت انہوں نے اپنے خادم سے کھانا طلب کیا۔

۹۰۔ خادم نے اپنی بھول کا اعتراف کرتے ہوئے مچھلی کے عجیب طریقہ سے سمندر میں چلے جانے کا واقعہ موسیٰ علیہ السلام کو سنا دیا۔ اور اس کا اصل محرک شیطان کو قرار دیا جو انسان کو بھلاوے میں ڈال کر اس کی توجہ اہم کاموں کی طرف سے ہٹاتا رہتا ہے۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۚ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾

۶۴ اس نے (موسیٰ نے) کہا یہی تو ہم چاہتے تھے ۹۱۔ پھر وہ دونوں اپنے نقش قدم پر واپس ہوئے۔ ۹۲

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

۶۵ وہاں انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنے پاس سے خاص علم عطا کیا تھا۔ ۹۳

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾

۶۶ موسیٰ نے اس سے کہا کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تا کہ رشد (معاملہ فہمی) کی جو تعلیم آپ کو دی گئی ہے اس میں سے آپ کچھ مجھے بھی سکھائیں۔ ۹۴

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾

۶۷ اس نے کہا آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے۔

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰي مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿٦٨﴾

۶۸ اور آپ ان باتوں پر کس طرح صبر کر سکیں گے جو آپ کے دائرہ علم سے باہر ہیں۔ ۹۵

قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿٦٩﴾

۶۹ اس نے (موسیٰ نے) کہا انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملہ بھی آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿٧٠﴾

۷۰ اس نے کہا اگر آپ کو میرے ساتھ رہنا ہے تو کسی چیز کے بارے میں مجھ سے نہ پوچھیں، جب تک کہ میں خود آپ سے اس کا ذکر نہ کروں۔ ۹۶

فَانْطَلَقَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ۭ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـــًٔا اِمْرًا ﴿٧١﴾

۷۱ پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب وہ ایک کشتی میں سوار ہو گئے تو اس نے اس میں شگاف کر دیا۔ موسیٰ نے کہا آپ نے اس میں شگاف کر دیا تا کہ کشتی والوں کو غرق کر دیں۔ یہ تو آپ نے عجیب حرکت کی۔ ۹۷

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٢﴾

۷۲ اس نے کہا میں نے آپ سے کہا نہ تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے؟

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿٧٣﴾

۷۳ موسیٰ نے کہا بھول چوک پر گرفت نہ کیجئے اور میرے معاملہ میں سختی سے کام نہ لیجئے۔

فَانْطَلَقَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـــًٔا نُّكْرًا ﴿٧٤﴾

۷۴ پھر دونوں چلے یہاں تک کہ انہیں ایک لڑکا ملا، اس نے اسے قتل کر دیا۔ موسیٰ نے کہا آپ نے ایک بے گناہ کو قتل کر دیا، حالانکہ اس نے کسی کی جان نہیں لی تھی۔ آپ نے یہ بڑی ناروا حرکت کی۔ ۹۸

۹۱؎ یعنی یہی تو وہ مقام ہے جس کی ہمیں تلاش تھی۔ مچھلی کا زندہ ہو کر عجیب طریقہ سے سمندر میں چلا جانا منزل کی نشاندہی کرتا ہے۔

۹۲؎ یعنی دونوں اپنے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے واپس ہوئے۔ قدموں کے نشانات صحرا میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اس طرح چٹان کے پاس پہنچ گئے جہاں وہ اپنی مچھلی بھول گئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چٹان صحرا میں ساحل سے قریب تھی۔

۹۳؎ چٹان کے پاس ان کی ملاقات اللہ کے ایک خاص بندے سے ہوئی جس کا نام حدیث میں خضرؑ آیا ہے۔ ''جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا'' کا اشارہ نبوت کی طرف ہے کہ ہم نے اس بندۂ خاص کو نبوت سے سرفراز کیا تھا۔ اور ''اپنے پاس سے خاص علم عطا کیا تھا'' سے مراد تکوینی (غیر اختیاری) معاملات میں اللہ کے فیصلوں کے اسرار و رموز کا علم ہے۔ آگے آیت ۸۲ میں اس بندۂ خدا کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ''میں نے یہ کام اپنی رائے سے نہیں کیا'' جو اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کا حکم بذریعہ وحی اس کو پہنچتا تھا جس کی وہ تعمیل کرتا تھا۔ وحی کا اس طرح نزول ایک نبی ہی پر ہوتا ہے۔ اور اسی بنا پر اس کی بات لوگوں کے لئے حجت ہوتی ہے۔

جہاں تک جمہور مفسرین کا تعلق ہے وہ اس بندہ خدا کے نبی ہونے ہی کے قائل ہیں۔ البتہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ وہ فرشتہ تھا۔ ان کے اس خیال کی تائید آیت کے ان الفاظ سے نہیں ہوتی کہ ''جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا''۔ کیوں کہ قرآن میں کسی مقام پر بھی کسی فرشتہ کے بارے میں اس طرح کی بات نہیں کہی گئی ہے کہ اسے رحمت سے نوازا گیا تھا۔ اور فرشتے تو تکوینی احکام کے نافذ کرنے پر مامور ہوتے ہیں۔ اس لئے رحمت سے نوازے جانے کی بات فرشتہ کے بارے میں موزوں نہیں ہوسکتی۔ بلکہ یہ بات نبی ہی کے لئے موزوں قرار پائی ہے۔

۹۴؎ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو الگ الگ امتیازات بخشے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کو ہم کلامی کا شرف بخشا، تو عیسیٰ علیہ السلام کو مُردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ عطا کیا تھا۔ یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر کا علم بخشا تھا، تو سلیمان علیہ السلام کو پرندے کی زبان سمجھنے کی صلاحیت بخشی تھی۔ اسی طرح خضر علیہ السلام کو ظاہری حالات و واقعات کے پیچھے جو اسرار پوشیدہ ہوتے ہیں ان کا علم بخشا گیا تھا، جس نے ان کے اندر معاملہ فہمی کی غیر معمولی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام ایک جلیل القدر نبی اور رسول تھے جو خضر علیہ السلام کے اسی امتیازی علم سے استفادہ کرنا چاہتے تھے اور اسی غرض سے انہوں نے یہ سفر کیا تھا۔

۹۵؎ حضرت خضر پر اللہ تعالیٰ جن تکوینی امور کے اسرار کھول دیتا تھا ان کے سلسلہ میں وہ مناسب عملی تدابیر اختیار کرتے تھے۔ مگر چونکہ حضرت موسیٰ کے دائرہ علم میں یہ باتیں نہیں تھیں اس لئے وہ ان تدابیر کو غلط باور کرنے میں حق بہ جانب تھے۔ اور انسان ظاہری حالات کو دیکھ کر ہی حکم لگاتا ہے۔ اس لئے حضرت خضر کا اندازہ صحیح تھا کہ جو غیر معمولی کام وہ انجام دیں گے ان کو وہ برداشت نہ کرسکیں گے۔

۹۶؎ یہ علم کی راہ میں موسیٰ علیہ السلام کے صبر کا امتحان تھا۔ سوال نہ کرنے کی کڑی شرط حضرت خضر نے اس لئے عائد کی تھی کہ حضرت موسیٰ کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے کہ ان کے علم اور ان کے کام کی نوعیت کیا ہے۔

۹۷؎ حضرت موسیٰ کا یہ اعتراض ظاہر کے لحاظ سے تھا اور بجا تھا۔ جب کہ حضرت خضر نے یہ کام ایک مصلحت سے کیا تھا جو اپنی جگہ صحیح تھی۔ مگر مخفی تھی جیسا کہ آگے بیان ہوا ہے۔

حضرت خضر کی رہنمائی میں جس سفر کا آغاز ہوا اس میں حضرت موسیٰ کے خادم کے ساتھ چلنے کا ذکر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے ان کو چٹان کے پاس ہی چھوڑ دیا گیا تھا کہ واپسی میں حضرت موسیٰ ان کو اپنے ساتھ لے لیں گے۔ (واللہ اعلم)

۹۸؎ بظاہر لڑکا کسی ایسے جرم کا یا کسی کے قتل کا مرتکب نہیں ہوا تھا کہ اسے قتل کر دیا جاتا، اس لئے حضرت موسیٰ سے رہا نہ گیا اور انہوں نے اس فعل کو منکر قرار دیا۔ جب کہ حضرت خضر نے ایک مخفی مصلحت سے یہ خدمت انجام دی تھی جیسا کہ آگے بیان ہوا ہے۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾

۷۵ اس نے کہا کیا میں نے کہا نہ تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کرسکیں گے؟

قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾

۷۶ موسیٰ نے کہا اگر اس کے بعد میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھئے۔ میری طرف سے آپ کو عذر مل گیا۔

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨاسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾

۷۷ پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ ایک بستی والوں کے پاس پہنچے اور ان سے کھانا طلب کیا مگر انہوں نے ان کی مہمان نوازی سے انکار کر دیا۹۹۔ وہاں انہوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی۔ اس نے اس دیوار کو کھڑا کر دیا۔ موسیٰ نے کہا اگر آپ چاہتے تو اس کی اجرت لے لیتے۔۱۰۰۔

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾

۷۸ اس نے کہا یہ میرے اور آپ کے درمیان جدائی کی بات ہوئی۱۰۱۔ اب میں آپ کو ان باتوں کی حقیقت بتاتا ہوں جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَاۗءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾

۷۹ کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند مسکینوں کی تھی جو سمندر میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اس کو عیب دار کر دوں کیوں کہ آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر (اچھی) کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔۱۰۲۔

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴿۸۰﴾

۸۰ لڑکے کا معاملہ یہ ہے کہ اسکے والدین مؤمن تھے۔ ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ اپنی سرکشی اور کفر سے انہیں کہیں تکلیف میں مبتلا نہ کرے۔

فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾

۸۱ اس لئے ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کی جگہ ان کو ایسی اولاد دے جو اس کے مقابلہ میں پاکیزگی کے لحاظ سے بھی بہتر ہو اور ہمدردی میں بھی بڑھ کر ہو۔۱۰۳۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۡ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾

۸۲ رہی دیوار تو وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی جس کے نیچے ان کا خزانہ تھا اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ آپ کے رب نے چاہا کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکال لیں ۱۰۴۔ یہ آپ کے رب کی رحمت سے ہوا۔ میں نے جو کچھ کیا اپنے اختیار سے نہیں کیا ۱۰۵۔ یہ ہے ان باتوں کی حقیقت جس پر آپ صبر نہ کر سکے۔۱۰۶۔

۹۹۔ مسافر کو کھانا کھلانا اخلاق کا تقاضا ہے، اور اُس زمانہ میں مسافروں کے لئے کھانے پینے کی وہ سہولتیں نہیں تھیں جو موجودہ دور میں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے معروف طریقہ یہی تھا کہ کوئی مسافر کسی بستی میں آجائے تو اس کی مہمان نوازی کی جائے۔ مگر اس بستی والوں نے ان معزز مہمانوں کی ایسی ناقدری کی کہ ایک وقت کا کھانا فراہم کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

۱۰۰۔ حضرت موسیٰ نے یہ بات اس لئے کہی کہ بستی کے لوگ اس بات کے مستحق نہیں تھے، کہ ان کی خدمت انجام دی جائے جب کہ انہوں نے بھوکے مسافروں کو ایک وقت کھانا کھلانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ مگر حضرت خضر کے پیش نظر دوسری مصلحت تھی جس پر ابھی پردہ پڑا ہوا تھا۔

۱۰۱۔ حضرت موسیٰ کا یہ اعتراض تیسری مرتبہ تھا اس لئے مزید عذر کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہی۔ اور جدائی کی نوبت آگئی۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ انسان خواہ وہ ایک پیغمبر ہی کیوں نہ ہو ظاہر پر حکم لگاتا ہے۔ اور جب تک باطنی مصلحتیں وحی کے ذریعہ اس پر واضح نہ کی جائیں وہ ظاہر پر حکم لگانے کے لئے مجبور ہے۔ شریعت کا مطالبہ بھی اس سے اس کے علم کی حد تک ہی ہے۔

۱۰۲۔ یعنی کشتی کو عیب دار بنانا خالی از مصلحت نہ تھا۔ دراصل اس سے مقصود غریبوں کی کشتی کو ظالم بادشاہ کے غاصبانہ قبضہ سے بچانا تھا۔ یہ بادشاہ اپنے علاقہ سے گذرنے والی ہر اس کشتی پر زبردستی قبضہ کر لیتا تھا جو درست حالت میں پائی جاتی۔ حضرت خضر نے یہ تدبیر کی کہ کشتی کا ایک تختہ نکال دیا تا کہ بادشاہ کے کارکنان اسے ٹوٹی ہوئی کشتی کا خیال کر کے نظر انداز کریں۔ انہوں نے یہ تدبیر اس مخصوص علم کی بنا پر کی تھی جو انہیں عطا ہوا تھا۔ اور چونکہ وہ نبی تھے اس لئے ظاہر ہے انہیں بادشاہ کی ظالمانہ کارروائی سے بذریعہ وحی مطلع کر دیا گیا ہوگا۔

حضرت موسیٰ کا اعتراض ظاہر کے لحاظ سے تھا اور صحیح تھا۔ اور حضرت خضر کی تدبیر اس مخصوص علم کی بنا پر تھی جو انہیں عطا ہوا تھا۔ اور اس لحاظ سے یہ تدبیر بالکل صحیح اور مفید تھی اگرچہ اس کی مصلحت موسیٰ پر واضح نہیں تھی۔

رہا یہ سوال کہ دوسرے کی کشتی میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کس طرح کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ تصرف اللہ کے حکم سے کیا گیا تھا اس لئے یہ تصرف بالکل جائز تھا۔ دوسرے یہ کہ بعض حالات میں کسی کو نقصان سے بچانے کے لئے اس کی مِلک میں تصرف کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً اگر ایک گھر کو آگ لگ گئی ہے اور اس کا دروازہ بند ہے اور اس کو توڑے بغیر آگ کو بجھایا نہیں جا سکتا، تو مالک کی اجازت کا انتظار کئے بغیر دروازہ کو توڑ دیا جائے گا۔ کسی فرد یا سوسائٹی کو ضرر سے بچانے کے لئے اس قسم کے تصرف کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

۱۰۳۔ متن میں لفظ ''غلام'' استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق نابالغ لڑکے پر بھی ہوتا ہے اور بالغ لڑکے پر بھی۔ سورۂ یوسف میں گذر چکا کہ جب قافلہ والوں میں سے ایک شخص نے کنویں میں ڈول ڈالنے پر یوسف کو پایا تھا تو وہ پکار اٹھا تھا یا بشریٰ ھذا غلام (خوشخبری ہو یہ تو لڑکا ہے)، حالانکہ اس وقت یوسف کی عمر ۱۷ سال تھی۔ اس لئے یہ لڑکا جس کو حضرت خضر نے قتل کیا بالغ رہا ہوگا اور کافر بھی۔ اس کے والدین مؤمن تھے اس لئے لڑکے کا کافر ہونا اس کے مرتد ہونے کے ہم معنیٰ تھا۔ اور مرتد کی سزا اسلام میں قتل ہے۔ پھر یہ لڑکا سرکش بھی تھا۔ یہ صورت حال جب حضرت خضر پر وحی کے ذریعہ واضح ہوئی تو انہوں نے اندیشہ محسوس کیا، کہ یہ لڑکا اپنے والدین کو سخت تکلیف پہنچائے گا اس اندیشہ کے پیش نظر انہوں نے دعا کی کہ اللہ ان کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے۔ ایسا بدل جو عقیدہ و اخلاق کے لحاظ سے بھی خوب پاکیزہ ہو اور بہت زیادہ رحم دل بھی، تا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کرے۔ اس کے بعد حکم الٰہی سے انہوں نے اس لڑکے کو قتل کر دیا۔ یہ قتل یا تو ایک مرتد کا قتل تھا جو شرعاً جائز ہے، یا اگر لڑکا نابالغ تھا تو یہ ایک طرح سے اللہ کے تکوینی حکم کا نفاذ تھا، جو غیر معمولی طور پر ایک نبی کے ہاتھوں انجام پایا۔ ایسی صورت میں اس کو قتل کے عام احکام پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ ایک استثنائی صورت تھی جو حضرت خضر کے ساتھ مخصوص تھی اور جس کو صاحب شریعت موسیٰ علیہ السلام پر بھی واضح کر دیا گیا۔ یہ ایسا ہی استثنائی حکم تھا جیسا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیل کو ذبح کرنے کا دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ حضرت ابراہیم کے نبی ہونے کی حیثیت میں ایک مخصوص حکم تھا۔ اسی طرح حضرت خضر کو ایک کافر لڑکے کو قتل کرنے کا حکم ان کے نبی ہونے کی حیثیت میں مخصوص

طور پر دیا گیا تھا۔اس لئے نہ اس پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے اور نہ دوسروں کے لئے یہ وجہ جواز بن سکتا ہے۔

حضرت خضر نے اپنے لئے جمع کی جو ضمیر استعمال کی یعنی یہ جو فرمایا ''ہم نے یہ اندیشہ محسوس کیا'' اور ''ہم نے چاہا'' تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قتل کا یہ کام اصلاً تکوینی نوعیت کا تھا، جسے فرشتے ہی انجام دے سکتے تھے۔اس لئے عجب نہیں کہ اس کام میں فرشتے حضرت خضر کے معاون رہے ہوں۔اور ان کی معاونت کے پیش نظر انہوں نے جمع کے ضمیر ''ہم'' استعمال کی ہو۔قتل کا یہ کام ساحل سمندر پر جس خاموشی کے ساتھ انجام پایا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کے حکم کے اس نفاذ میں فرشتے حضرت خضر کے معاون رہے ہوں گے۔

۱۰۴۔ بستی والوں کے ناروا سلوک کے باوجود دیوار بلا معاوضہ کھڑا کرنے کی خدمت، حضرت خضر نے اس لئے انجام دی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ خبر دے دی تھی کہ اس دیوار کے نیچے یتیموں کا مال مدفون ہے۔اگر دیوار گر جاتی تو کوئی شخص بھی مال نکال کر ہڑپ کر سکتا تھا جب کہ بستی کے لوگ بد اخلاق تھے۔حضرت خضر نے بستی والوں کے سلوک کو جو ان کے ساتھ کیا گیا تھا خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے ہاتھ سے دیوار کی مرمت کر دی۔یہ بڑے خیر کا کام تھا جو ان کے ہاتھوں انجام پایا۔

۱۰۵۔ یہ واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ نبی تھے۔کیوں کہ یہ کام انہوں نے اپنی رائے اور اپنے اختیار سے نہیں کئے تھے بلکہ حکم الٰہی سے کئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے حضرت خضر کو جو خاص علم بخشا گیا تھا اس کی بنا پر خاص طرح کی خدمت بھی ان کے سپرد ہوئی تھی، یعنی ایسی تدابیر اختیار کرنا جس کی مصلحت واضح نہ ہو۔لیکن نتیجہ کے اعتبار سے وہ کام خیر کا باعث اور لوگوں کی فلاح و بہبودی کا موجب ہو۔

۱۰۶۔ حضرت موسیٰ کے اس سفر کی سرگزشت جو ایک خاص علم کے حصول کے لئے تھا یہاں ختم ہوگئی۔اس سرگزشت کو بیان کرنے سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ تکوینی طور پر ایسے واقعات پیش آتے ہیں۔اور ایسے حالات رونما ہوتے ہیں جن کے حقیقی مصالح پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ظاہر بیں نگاہیں ان کو دیکھ نہیں پاتیں۔لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت و ربوبیت پس پردہ کام کر رہی ہوتی ہیں۔اس کی ایک جھلک ان واقعات میں دیکھی جا سکتی ہے جو حضرت موسیٰ کو خضر کے تعلق سے پیش آئے۔لہٰذا کفر و اسلام کی کشمکش میں اہل ایمان کو جن ناسازگار حالات سے گذرنا پڑ رہا ہے اس سے وہ کبیدہ خاطر نہ ہوں۔عجب نہیں کہ اس کے اندر سے بہت بڑا خیر اُبھر آئے اور اس کی رحمتیں جو بادلوں میں چھپی ہوئی ہیں ان کا نزول ہو۔اس لئے انہیں چاہئے کہ اللہ پر توکل کرتے ہوئے صبر سے کام لیں۔

دوسرا سبق جو اس سرگزشت سے دینا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ یہ دنیا حادثات اور واقعات کی دنیا ہے۔اس کے پیچھے جو عظیم مصالح ہیں ان پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ ضروری ہے کہ ایک دن ایسا آئے۔جب حقیقت کو بے نقاب کیا جائے، تاکہ لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ دنیا اندھیر نگری نہیں تھی۔بلکہ ایک علیم و حکیم ہستی کا منصوبہ تھا جس کی پشت پر عظیم مصلحتیں کارفرما تھیں۔اللہ تعالیٰ نے قیامت کا دن اسی لئے مقرر کیا ہے تاکہ دنیا کے اسرار پر سے پردہ اٹھ جائے اور دنیا کے بارے میں صحیح اور غلط نقطۂ نظر رکھنے والوں کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ ملے۔

اور وہ تم سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہو اس کا کچھ حال تمہیں سُناتا ہوں۔ ہم نے اس کو زمین میں اقتدار بخشا تھا اور ہر طرح کے اسباب و وسائل عطا کئے تھے۔ تو اس نے ایک مہم کے لئے سروسامان کیا۔ یہاں تک کہ وہ سورج کے غروب ہونے کے مقام تک پہنچ گیا۔ وہاں اس نے سورج کو سیاہ چشمہ میں ڈوبتے ہوئے دیکھا۔ اور اس کے پاس اس کو ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین! چاہو انہیں سزا دو اور چاہو ان کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ (القرآن)

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝۸۳

۸۳ اور وہ تم سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں ۱۰۷؎۔ کہو اس کا کچھ حال تمہیں سُناتا ہوں۔

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝۸۴

۸۴ ہم نے اس کو زمین میں اقتدار بخشا تھا اور ہر طرح کے اسباب و وسائل عطا کئے تھے۔ ۱۰۸؎

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝۸۵

۸۵ تو اس نے ایک مہم کے لئے سروسامان کیا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۭ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۝۸۶

۸۶ یہاں تک کہ وہ سورج کے غروب ہونے کے مقام تک پہنچ گیا۔ وہاں اس نے سورج کو سیاہ چشمہ میں ڈوبتے ہوئے دیکھا۔ ۱۰۹؎ اور اس کے پاس اس کو ایک قوم ملی ۱۱۰؎۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین! چاہو انہیں سزا دو اور چاہو ان کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ ۱۱۱؎

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝۸۷

۸۷ اس نے کہا جو، ان میں سے ظلم کرے گا اس کو ہم سزا دیں گے ۱۱۲؎۔ پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا اور وہ اسے سخت عذاب دے گا۔

وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَاۗءَ ۨ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝۸۸

۸۸ اور جو ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا تو اس کے لئے اچھا بدلہ ہے اور ہم اس کو ایسی باتوں کا حکم دیں گے جو آسان ہوں۔ ۱۱۳؎

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝۸۹

۸۹ پھر اس نے (ایک اور مہم کے لئے) سروسامان کیا۔ ۱۱۴؎

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰي قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝۹۰

۹۰ یہاں تک کہ جب وہ سورج کے طلوع ہونے کے مقام تک پہنچ گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتا ہے جس کے بالمقابل ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی ہے۔ ۱۱۵؎

كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝۹۱

۹۱ اس طرح ہم نے (اس کو اس قوم پر بھی غلبہ عطا کیا) اور اس کے پاس جو کچھ تھا اس سے ہم پوری طرح باخبر تھے۔ ۱۱۶؎

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝۹۲

۹۲ پھر اس نے (تیسری مہم کا) سروسامان کیا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝۹۳

۹۳ یہاں تک کہ جب وہ دو (پہاڑوں کی) دیواروں کے درمیان پہنچا تو اسے ان کے اِس طرف ایک ایسی قوم ملی جو کوئی بات سمجھ نہیں پاتی تھی۔ ۱۱۷؎

قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝۹۴

۹۴ ان لوگوں نے کہا اے ذوالقرنین! یاجوج و ماجوج اس ملک میں فساد مچاتے ہیں، تو کیا ہم آپ کیلئے خراج مقرر کر دیں تاکہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دیں۔ ۱۱۸؎

۱۰۷؎ یہ سوال مشرکین مکہ نے یہود کے اشارہ پر کیا تھا۔ اور مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینا تھا۔ اگر واقعی آپ پر وحی آتی ہے تو ذوالقرنین کا حال بیان کریں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ نے نہ تاریخ کی معلومات کہیں سے حاصل کی ہیں اور نہ مذہبی کتابیں پڑھیں ہیں۔ اس لئے آپ اس سوال کا جواب نہیں دے سکیں گے۔ لیکن وحی الٰہی نے ذوالقرنین کے مسئلہ پر اس طرح روشنی ڈالی کہ آپ کی نبوت کا ایک اور ثبوت سامنے آ گیا۔

یہود کے اس سوال سے یہ بات آپ ہی واضح ہے کہ ان کے نزدیک ذوالقرنین کی شخصیت معروف تھی اور اس کا یہ لقب پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ اس لئے قرآن نے اس عالمگیر فاتح کی عظیم الشان فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے اس کی سیرت کے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا جن سے اس کی خدا خوفی، عدل پسندی اور خدا کے حضور جوابدہی کے شدید احساس کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لقب سے اس کے مشہور ہونے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کی سلطنت مغرب اور مشرق میں دور دور تک وسیع ہو گئی تھی۔ اور غالباً یہ پہلا حکمراں ہے جس کی حکومت انسانی آبادی کے بہت بڑے حصے پر قائم ہو گئی تھی۔

قرن کے معنیٰ سینگ کے ہیں اور ذوالقرنین کے معنیٰ دو سینگوں والا۔ دو سینگوں سے مراد مشرق و مغرب کے وہ دو کنارے ہیں جہاں انسانی آبادی ختم ہوتی تھی۔ اس کے بعد جو انسانی آبادی تھی وہ یا تو دوسری جہتوں میں تھی یا سمندر اور پہاڑ کو عبور کرنے کے بعد تھی۔

ذوالقرنین کی شخصیت نزول قرآن کے وقت معروف تھی۔ لیکن بعد میں پردۂ خفا میں چلی گئی۔ جب مفسرین نے اس کو متعین کرنے کی کوشش کی تو سکندر مقدونی کو جس کا دور ۳۲۳ قبل مسیح تا ۳۴۵ قبل مسیح رہا ہے اور جو ارسطو کا شاگرد تھا۔ مشہور عالمگیر فاتح ہونے کی بنا پر اس کا مصداق قرار دیا۔ حالانکہ سکندر مقدونی کے بارے میں یقین کے ساتھ نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمان تھا اور نہ یہ کہ وہ عادل بادشاہ تھا۔ اور نہ ہی اس کی مغرب میں کسی ایسی مہم کا تاریخی ثبوت ملتا ہے، جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے، بلکہ اس کے خلاف تاریخ اس کو ایک بُت پرست اور توسیع پسند حکمراں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ اس لئے اس کو قرآن کا ذوالقرنین نہیں قرار دیا جا سکتا۔

چونکہ ذوالقرنین کی شخصیت یہود میں معروف تھی اس لئے اس کی تحقیق کے لئے قدیم صحیفوں ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ موجودہ دور میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ان صحیفوں اور دوسرے تاریخی شواہد کے حوالوں سے اپنی تحقیق تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں پیش کی ہے۔ وہ اپنی تحقیق کی بنا پر خورس یعنی سائرس (Cyrus) کو جس کا دور ۵۲۹ قبل مسیح تا ۵۵۹ قبل مسیح تھا ذوالقرنین قرار دیتے ہیں۔

خورس فارس (ایران) کا حکمراں تھا۔ اس نے فارس اور میڈیا (شمالی ایران) کی متحدہ سلطنت بنانے کے بعد مغرب کا رخ کیا تھا اور اس کی فتوحات لیڈیا (ٹرکی) تک پہنچ گئی تھیں۔ اور مشرق میں بھی اس کا دائرہ سلطنت وسیع ہو گیا تھا۔ اس نے بابل کو فتح کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو جو بخت نصر کے زمانہ سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے آزاد کر کے یروشلم جانے کی اجازت دیدی۔ گویا بنی اسرائیل کے لئے خورس ایک نجات دہندہ کی حیثیت سے ظاہر ہوا تھا۔ اس لئے بائبل میں اس کا ذکر ایک اچھے حکمراں کی حیثیت سے ہوا ہے اور اس کو خدا کا چرواہا کہا گیا ہے (یسعیاہ ۴۴:۲۸) اور عزرا کے کتاب سے اس کے خدا پرست ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ (ملاحظہ ہو عزرا باب ۱؎ اور باب ۶؎) اس لئے اغلب ہے کہ خورس کی شخصیت ہی قرآن کا ذوالقرنین ہوگی۔

قدیم مورخ ہیروڈوٹس (Herodotus) نے سائرس کو فارس کی مقبول ترین شخصیت بتلایا ہے اور اس کی مہموں کا ذکر کیا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار اس کا تعارف اس طرح کراتا ہے:

''سائرس اخمینین شہنشاہیت کا بانی تھا۔ یہ شہنشاہیت پہلی عالمی ریاست (World State) ہے جس میں بحر ایجین سے لے کر دریائے سندھ تک کا علاقہ شامل تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ ایک روادار اور مثالی حکمراں تھا جسے قدیم اہل فارس نے بابائے قوم کے نام سے پکارا اور بائبل میں جسے بابل کے یہودی اسیروں کے تعلق سے نجات دہندہ کہا گیا۔'' (Ency. Birtanica. Vol. V.P. 409)

۱۰۸؎ یعنی ایک بہت بڑی سلطنت کیلئے جن وسیع تر ذرائع و وسائل کی ضرورت تھی اللہ کے فضل سے اسے حاصل ہو گئے تھے۔

۱۰۹؎ یعنی مغربی سمت خشکی کے آخری کنارے تک پہنچ گیا۔اس کے بعد سمندر تھا جس نے سیاہ جھیل کی شکل اختیار کر لی تھی۔ وہاں اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج اس گدلے پانی میں ڈوب رہا ہے۔سورج کا ڈوبنا عام محاورہ ہے،اس کے لفظی معنیٰ کوئی بھی مراد نہیں لیتا۔مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین مغربی مہم پر جب روانہ ہوا تو ملک پر ملک فتح کرتا ہوا ایک ایسے ملک میں پہنچ گیا جو خشکی کی آخری حد تھی۔اسکے آگے جھیل نما سمندر تھا اس لئے اس سے آگے بڑھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

سائرس کا دارالحکومت ہمدان (ایران) تھا اور وہ جب مغربی مہم پر روانہ ہوا تو لیڈیا (موجودہ ٹرکی) تک کا علاقہ فتح کر لیا۔اسکے مغرب میں بحر اجین پڑتا ہے اور ساحل کے پاس خلیج ازمیر نے ایک چشمہ یا جھیل کی سی شکل اختیار کر لی ہے،جس میں نہر غدیس کا سرخ مٹی سے ملا ہوا گدلا پانی گرتا ہے۔۔۔۔۔۔۔غالباً سائرس نے اسی کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھا ہوگا تو اسے اس گدلے پانی میں سورج ڈوبتا ہوا دکھائی دیا ہوگا۔(یہ تفصیل ڈاکٹر عبدالعلیم عبدالرحمن خضر کی کتاب مفاہیم جغرافیہ فی القصص القرآنی،قصۃ ذوالقرنین سے ماخوذ ہے جو عربی میں ہے اور دارالشروق جدہ سے شائع ہوئی ہے۔)

۱۱۰؎ یہ ترک قوم ہوگی جیسا کہ سائرس کے واقعات سے ظاہر ہے۔

۱۱۱؎ یعنی ذوالقرنین کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ ایک ایسی پوزیشن میں ہے کہ اگر وہ اس قوم کو سزا دینا چاہے تو پوری طرح اس پر قادر ہے،اگر حسن سلوک کرنا چاہے تو یہ بھی اس کے اختیار میں ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مفتوح قوم پر چاہے ظلم کرے یا چاہے احسان کرے بلکہ مطلب اس کی اس پوزیشن کو واضح کرنا ہے جو عملاً اسے حاصل ہو گئی تھی۔

۱۱۲؎ یعنی ہم سزا صرف ان ہی کو دیں گے جو ظالمانہ حرکتیں کریں گے ورنہ زیادتی کسی پر بھی نہیں کی جائے گی۔ذوالقرنین کے اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ ایک مفتوح قوم کے ساتھ اس کا رویہ اور اس کی حکومت کی پالیسی عدل وانصاف کی ہوگی۔

واضح رہے کہ سائرس نے جس وقت اقتدار سنبھالا اس وقت اس کے اطراف میں ظالمانہ حکومتیں قائم تھیں اور انسانیت،ظالم حکمرانوں سے تنگ آ گئی تھی۔ چنانچہ بابل کی حکومت ظلم وجور کا بدترین نمونہ تھی،جس نے بنی اسرائیل کو قید وبند کی زندگی گذارنے کے لئے مجبور کیا تھا۔ان ظالم حکمرانوں کے ظلم اور بربریت سے نجات دلانے کا کام اللہ تعالیٰ نے جس کے ہاتھ سے لیا ہو وہ سائرس تھا۔

قرآن نے ذوالقرنین کی جن فتوحات کا ذکر کیا ہے،اس کا مطلب یہی ہے کہ اس نے انسانیت کو ظلم وفساد سے نجات دلانے کے لئے یہ اقدامات کئے تھے۔ یہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت تھی۔اس کا مطلب ملک گیری اور اپنی شان وشوکت بڑھانا ہرگز نہ تھا۔دنیا میں جہاں ظلم کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں وہاں اللہ کے کرشمۂ رحمت کا ظہور بھی ہوتا ہے اور انصاف کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔

۱۱۳؎ اس سے واضح ہوا کہ ذوالقرنین کے پیش نظر صرف یہی مقصد نہیں تھا کہ مظلوم قوموں کو ظالم حکمرانوں کے پنجہ سے چھڑائیں،بلکہ یہ اعلیٰ مقصد بھی پیش نظر تھا کہ لوگوں کو توحید کی راہ دکھادی جائے اور آخرت کی جوابدہی کا شعور پیدا کر کے ایک صالح زندگی گذارنے کے لئے آمادہ کیا جائے۔

ذوالقرنین کے ان اقدامات سے جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے ایک بہت بڑی اصولی بات یہ بھی واضح ہوتی ہے،کہ اس پاکیزہ مقصد کے پیش نظر جنگی اقدامات کرنا جائز ہے۔

۱۱۴؎ یہ دوسری مہم مشرق کی طرف تھی۔

۱۱۵؎ یعنی وہ مشرق میں آبادیوں کو عبور کرتا ہوا ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا،جہاں لوگوں کے لئے دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی سامان نہیں تھا۔یعنی مکانات وغیرہ نہیں تھے بلکہ صحرا میں خانہ بدوشی کی زندگی گذار رہے تھے۔

سائرس اپنی مشرقی مہم میں بلخ تک پہنچا جو افغانستان میں ہے اور دوسری طرف مکران تک،جو بلوچستان میں ہے اس کے آگے پہاڑی سلسلہ تھا۔یہاں خانہ بدوش قبائل رہتے تھے جو تہذیب وتمدن سے بالکل ناآشنا تھے۔ (ملاحظہ ہو مفاہیم جغرافیہ فی القصص القرآنی ص ۲۶۲۔۲۶۳)

یہ وحشی قبائل ایران کی سرحد پر لوٹ مار کرتے اور فساد مچاتے رہے ہوں گے۔اس لئے سائرس نے ان کے علاقہ کی آخری حد تک پہنچ کر ان کی سرکوبی کی۔

۱۱۶؎ اس طرح اللہ نے ان وحشی قبائل پر بھی ذوالقرنین کو غلبہ عطا کیا۔اور اس کی ان تدابیر اور ان وسائل سے اللہ تعالیٰ پوری طرح باخبر تھا جو اس نے اس مہم کو سر کرنے کیلئے اختیار کئے۔

۱۱۷؎ یہ ذوالقرنین کی تیسری مہم کا ذکر ہے۔قرینہ دلیل ہے کہ وہ شمال کی طرف تھی۔وہ آگے بڑھا تو ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں دو پہاڑوں کے درمیان ایک درہ تھا اور اس کے پاس ایک غیر متمدن قوم رہتی تھی جو مشکل سے کوئی بات سمجھ پاتی تھی۔ممکن ہے غیر متمدن ہونے کے علاوہ اس کی زبان بھی مختلف رہی ہو۔

سائرس نے مغربی اور مشرقی ممالک کو فتح کرنے کے علاوہ اس وقت کی مشہور اور سب سے زیادہ مضبوط مملکت بابل کو بھی فتح کر لیا تھا۔اس کی سلطنت کا دائرہ بحر کسپین (Caspian Sea) تک وسیع ہو گیا تھا، اس لئے اس کی تیسری مہم شمال کی جانب رہی ہوگی۔تاریخ میں اگرچہ صراحت کے ساتھ اس کا ذکر نہیں ہے لیکن ''ہیروڈوٹس اور زینوفن'' دونوں یونانی مورخ تصریح کرتے ہیں کہ گورش نے فتح لیڈیا کے بعد ستھین قوم کے سرحدی حملوں کی روک تھام کے لئے خاص انتظامات کئے تھے۔(قصص القرآن مولانا حفظ الرحمٰن ج ۳ ص ۱۵۳) آذربائیجان اور ارمینیہ کے درمیان ایک نہر بھی ''نہر کورا'' کے نام سے مشہور ہے جو معلوم ہوتا ہے گورش یعنی سائرس کی طرف منسوب ہے۔شمال میں بحر کیسپین (Caspian Sea) اور بحر اسود (Black Sea) کے درمیان قوقاز (Caucasus) کا پہاڑی سلسلہ ہے جسے کوہ قاف کہتے ہیں۔اس پہاڑی سلسلہ کے درمیان ایک درہ تھا۔وہاں سائرس کو ایک قوم ملی جس کی بولی مختلف تھی۔

۱۱۸؎ اس قوم نے ذوالقرنین پر کسی طرح واضح کر دیا کہ اس درے سے یاجوج و ماجوج نکل آتے ہیں اور فساد برپا کرتے ہیں۔اس لئے آپ اس درہ کو دیوار سے پاٹ دیں تاکہ ان کی راہ مسدود ہو جائے، اس کام کے لئے ہم آپ کو ٹیکس دینے کے لئے تیار ہیں۔

یاجوج و ماجوج (Gog & Magog) سے مراد وہ قومیں ہیں جو کوہ قاف (Caucasus) کے شمال میں آباد تھیں اور روس سے منگولیا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ان کے بارے میں ان روایات کی کوئی اصل نہیں جن میں ان کو ایک عجیب و غریب مخلوق کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔بلکہ وہ ایسی ہی قومیں تھیں جیسی دوسری انسانی قومیں، البتہ وہ وحشی تھیں اور قریبی ممالک پر حملہ آور ہو کر لوٹ مار کرتی تھیں۔قرآن نے ان کا ذکر اس طور سے کیا ہے کہ وہ زمین میں فساد مچاتے تھے۔بائبل میں ماجوج کو نوح کی نسل سے بتایا گیا ہے یعنی یافث بن نوح کی اولاد۔(پیدائش: ۱۰:۱)

اور کتاب حزقیل میں ہے:

''پس اے آدم زاد تو جوج کے خلاف نبوت کر اور کہہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے دیکھ اے جوج روش اور مسک اور توبل کے فرمانروا میں تیرا مخالف ہوں ۔۔۔۔اور میں ماجوج پر اور ان پر جو بحری ممالک میں امن سے سکونت کرتے ہیں آگ بھیجوں گا اور وہ جانیں گے کہ میں خداوند ہوں۔'' (حزقیل باب ۳۹)

غالباً روش سے مراد روس (رشیا) مسک سے مراد ماسکو اور توبل سے مراد توبالسک ہے۔اس سے واضح ہوا کہ اس زمانہ میں روس میں وحشی قومیں رہتی تھیں اور غارت گری کیا کرتی تھیں:

''اور مشرق کی جانب یاجوج کی آبادیاں ہیں اور ان کے درمیان کوہ قاف حد فاصل ہے۔'' (مقدمہ ابن خلدون ص ۷۹)

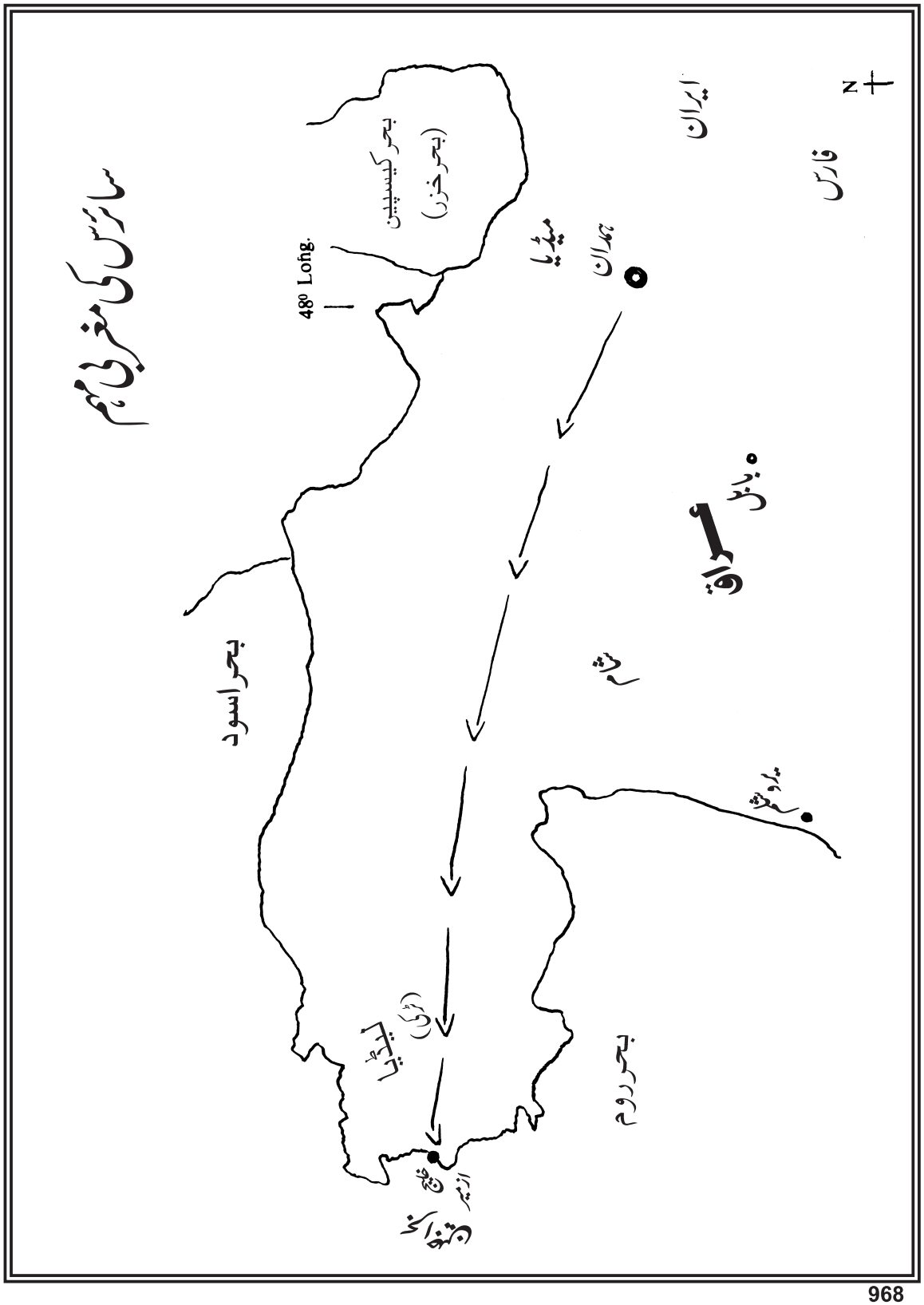

سائرس کی مغربی مہم
بحر کیسپین
(بحر خزر)
ایران
فارس
N
48⁰ Long.
میڈیا
ہمدان
بابل
عراق
شام
بحر اسود
یروشلم
بحر روم
لیڈیا
(ترکی)
ازمیر

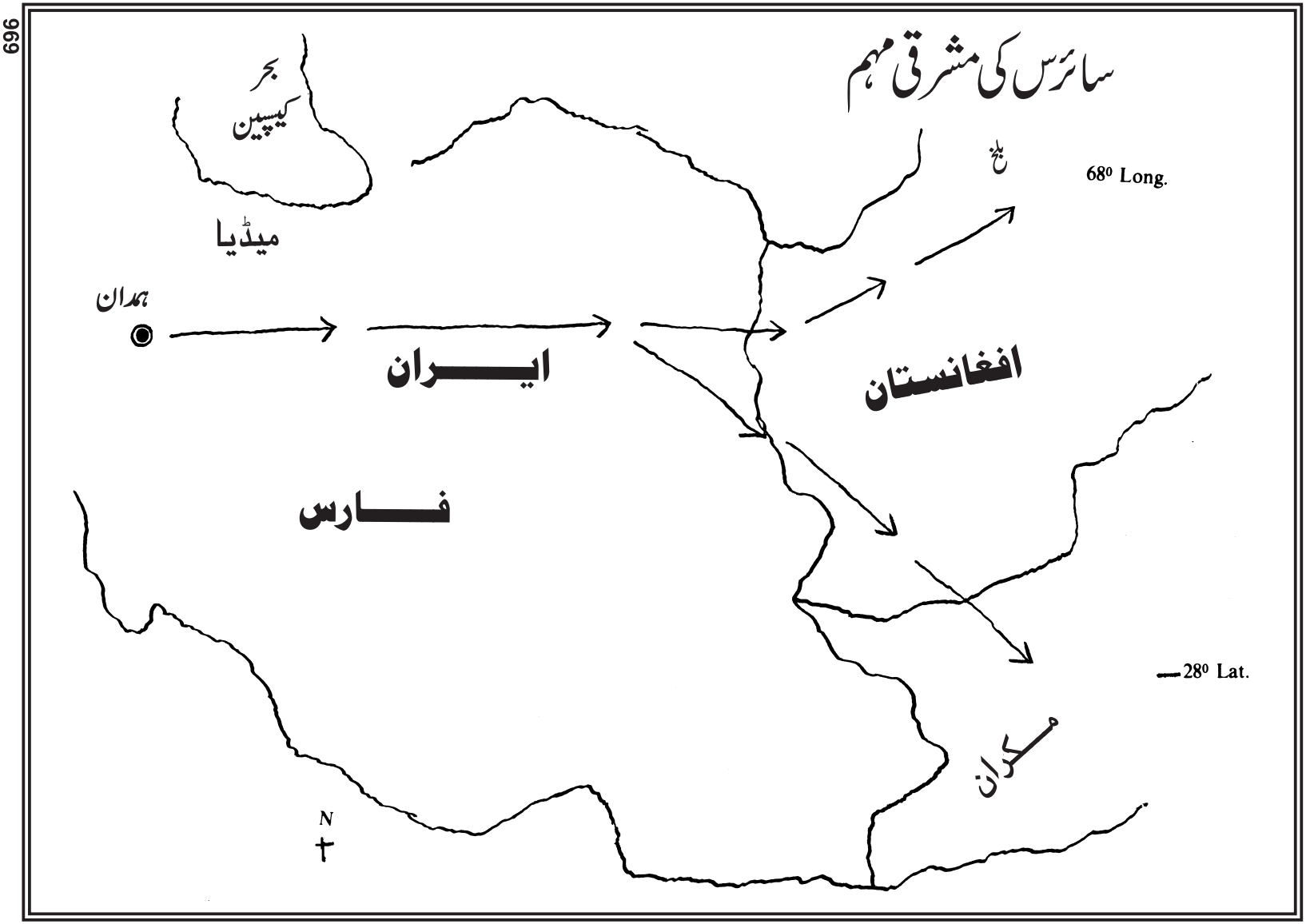

سائرس کی مشرقی مہم
68⁰ Long.
28⁰ Lat.
بلخ
افغانستان
دریا
ایران
فارس
بحر کیسپین
میڈیا
ہمدان
N

سائرس کی تیسری مہم
اور
آہنی دیوار کی تعمیر

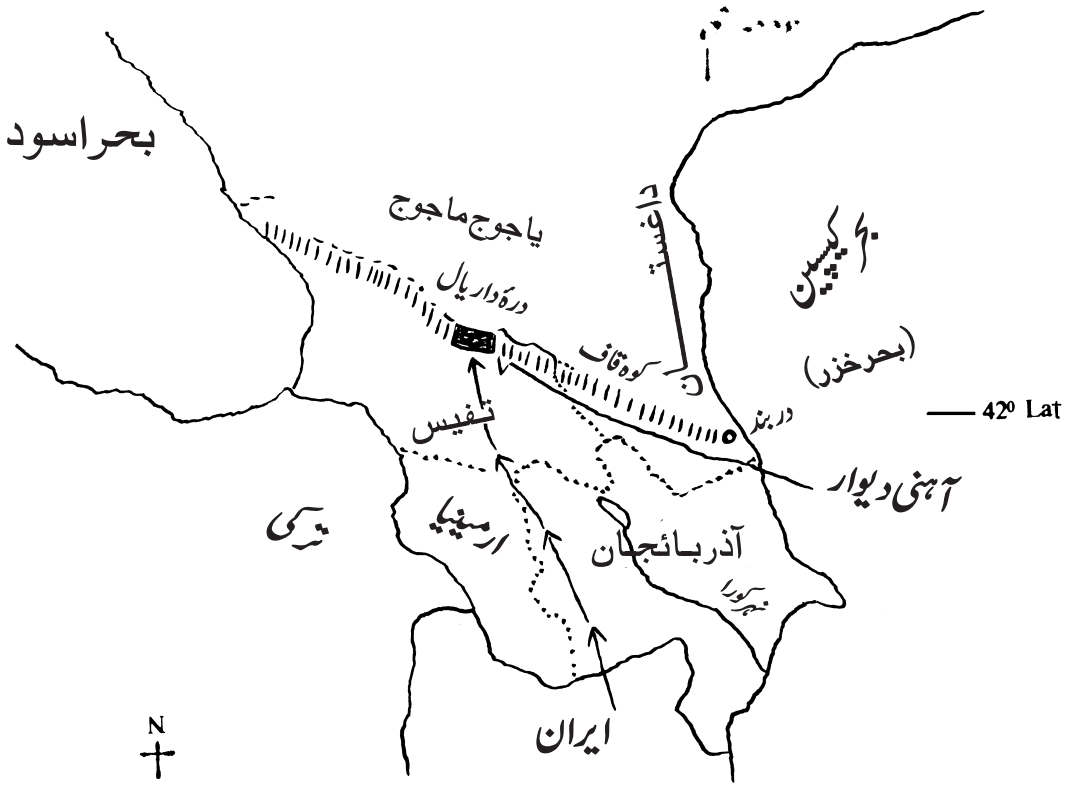

اس نے کہا میرے رب نے جو کچھ میرے قبضہ میں دے رکھا ہے وہ بہتر ہے۔تم قوت سے میری مدد کرو میں تمہارے اور ان کے درمیان دیوار بنا دیتا ہوں۔ میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لاؤ، یہاں تک کہ جب دونوں پہاڑوں کے درمیان خلا کو بھر دیا تو حکم دیا کہ اس کو دھونکو یہاں تک کہ جب اس کو بالکل آگ (کی طرح سرخ) کر دیا، تو اس نے کہا لاؤ اب اس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیل دوں۔ (اور جب دیوار بن گئی) تو یاجوج وماجوج نہ اس پر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس میں نقب لگا سکتے تھے۔(القرآن)

قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾

۹۵ اس نے کہا میرے رب نے جو کچھ میرے قبضہ میں دے رکھا ہے وہ بہتر ہے۔تم قوت سے میری مدد کرو میں تمہارے اور ان کے درمیان دیوار بنا دیتا ہوں۔۱۱۹؎

اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾

۹۶ میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لاؤ، یہاں تک کہ جب دونوں پہاڑوں کے درمیان خلا کو بھر دیا تو حکم دیا کہ اس کو دھونکو یہاں تک کہ جب اس کو بالکل آگ (کی طرح سرخ) کر دیا، تو اس نے کہا لاؤ اب اس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیل دوں۔۱۲۰؎

فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾

۹۷ (اور جب دیوار بن گئی) تو یاجوج وماجوج نہ اس پر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس میں نقب لگا سکتے تھے۔۱۲۱؎

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّاۗءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴿۹۸﴾

۹۸ اس نے کہا یہ میرے رب کی مہربانی ہے۔پھر جب میرے رب کا وعدہ ظہور میں آئے گا تو اسے خاک میں ملا دے گا۔اور میرے رب کا وعدہ بالکل سچا ہے۔۱۲۲؎

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾

۹۹ اور اس دن ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے کہ وہ موجوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرائیں ۱۲۳؎۔اور صور پھونکا جائے گا اور ہم سب کو جمع کریں گے۔۱۲۴؎

وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَىِٕذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَۨا ﴿۱۰۰﴾

۱۰۰ اس دن ہم کافروں کے سامنے جہنم پیش کریں گے۔۱۲۵؎

الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَاۗءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾

۱۰۱ وہ جن کی آنکھوں پر میرے ذکر سے (غفلت کی بنا پر) پردہ پڑا رہا اور وہ کوئی بات سن نہیں سکتے تھے۔۱۲۶؎

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَاۗءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

۱۰۲ کیا ان کافروں نے یہ خیال کر رکھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز بنالیں گے ۱۲۷؎؟ ہم نے کافروں کی ضیافت کے لئے جہنم تیار کر رکھی ہے۔۱۲۸؎

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾

۱۰۳ کہو کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ تباہ حال لوگ کون ہیں؟

اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾

۱۰۴ وہ جن کی کوششیں اس دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔۱۲۹؎

۱۱۹؎ یعنی اللہ نے مجھے اتنے وافر وسائل عطا کئے ہیں کہ اس دیوار کی تعمیر کے لئے، جس کا مقصد مفسدوں کی راہ روکنا ہے تم سے ٹیکس وصول کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خدمت میں انجام دوں گا البتہ تم اس کام میں محنت اور قوت سے شریک ہو جاؤ۔

۱۲۰؎ معلوم ہوا کہ یہ دیوار مٹی اور پتھر سے نہیں بلکہ لوہے اور تانبے سے بنائی گئی تھی۔ لوہے کے تختوں کو کھڑا کر کے خوب دھونکا گیا اور جب وہ آگ کی طرح سرخ ہو گئی تو ان پر پگھلایا ہوا تانبا انڈیل دیا گیا۔ اس طرح یہ آہنی دیوار تیار ہو گئی۔

جہاں تک لوہے اور تانبے کی فراہمی کا سوال ہے، کوہ قاف کے قریبی علاقہ آذربائیجان میں لوہے کی بہ کثرت کانیں پائی جاتی ہیں۔ اور ارمینیہ میں لوہے کے علاوہ تانبے وغیرہ کی بھی۔ (ملاحظہ ہو مفاہیم جغرافیہ فی القصص القرآنی ص ۳۰۷) دیوار دو پہاڑوں کے درمیان تعمیر کی گئی تھی یہ درۂ داریال تھا جو مسدود ہو گیا۔

۱۲۱؎ اس دیوار کی تعمیر سے یاجوج ماجوج کی غارت گری کا سلسلہ رک گیا۔ دیوار بلند تھی اس لئے وہ اس کے اوپر چڑھ کر نہیں آسکتے تھے اور آہنی تھی اس لئے وہ اس میں شگاف بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح یہ عظیم خدمت ذوالقرنین کے ہاتھوں انجام پائی۔

۱۲۲؎ اس تاریخی دیوار کی تعمیر کو ذوالقرنین نے اپنا کارنامہ نہیں قرار دیا، بلکہ ایک بندۂ مومن کی طرح کہا کہ یہ اللہ کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ اور قیامت پر یقین رکھتے ہوئے کہا کہ یہ دیوار کتنی ہی مضبوط ہو لیکن لازوال نہیں ہے۔ قیامت کے دن تو بہر حال اسے ریزہ ریزہ ہونا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ یہ دیوار قیامت تک قائم رہے گی، بلکہ مطلب یہ تھا کہ اگر یہ طویل مدت تک قائم بھی رہی تو قیامت کے دن اسے فنا ہونا ہی ہے۔

یہ آہنی دیوار ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی، چنانچہ عباسی خلیفہ واثق باللہ نے اپنے بعض عمال کو اس کی تحقیق کے لئے بھیجا تھا اور انہوں نے یہ رپورٹ پیش کی تھی کہ یہ دیوار لوہے کی انٹیوں سے بنائی گئی ہے، جس میں پگھلا ہوا تانبا بھی شامل کیا گیا ہے۔ اور اس کا آہنی دروازہ مقفل ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۲۱ ص ۱۷۰)

۱۲۳؎ اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔ ذوالقرنین کا بیان اس بات پر ختم ہوا تھا کہ ''میرے رب کا وعدۂ برحق ہے'' اس وعدۂ برحق کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے یہ باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔

قیامت کا جب آغاز ہوگا تو لوگ گھبراہٹ کی وجہ سے نکل پڑیں گے۔ انسانوں کا ایک سیلاب ہوگا جو امڈ پڑے گا۔ لوگ بے تحاشا بھاگ رہے ہوں گے اور اس بھاگ دوڑ میں ایک دوسرے سے بری طرح ٹکرائیں گے۔

۱۲۴؎ انسانوں کے باہم ٹکرا جانے کا واقعہ پہلے صور کے موقع پر پیش آئے گا۔ اس حادثہ کے نتیجہ میں سب انسان مر جائیں گے۔ اس کے بعد جب دوسرا صور پھونکا جائے گا تو سب انسان خواہ وہ کسی زمانہ میں اور کسی جگہ مرے ہوں دوبارہ زندہ ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے حضور پیشی کے لئے جمع کرے گا، اس طرح پوری نوع انسانی حشر میں جمع ہوگی۔

۱۲۵؎ جو لوگ جہنم کا انکار کرتے رہے ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے رہے ہیں، قیامت کے دن ان کے سامنے جہنم پیش کر دی جائے گی، کہ لو اب اپنے سر کی آنکھوں سے جہنم کو دیکھ لو۔

۱۲۶؎ یعنی ان کو ہوش میں لانے کے لئے جو نصیحت نازل کی گئی تھی اس سے انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اور اس کو سننے کے لئے بھی وہ آمادہ نہ تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو سماعت و بصارت کی قوتیں اس لئے عطا کی ہیں کہ وہ اس کی نشانیوں کو دیکھے اور اس کی نصیحت کو سُنے۔ مگر جب وہ اس مقصد کے لئے ان قوتوں کا استعمال نہیں کرتا تو وہ معطل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ پھر نہ اسے خدا پرستی کی کوئی شان دکھائی دیتی ہے اور نہ وہ نصیحت سننے کا روادار ہوتا ہے۔

کافروں کی اگر نفسیات کا تجزیہ کیا جائے تو، یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ وہ کس طرح گمراہی پر اپنے کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جہاں قوت فیصلہ عطا کیا ہے وہاں اس کے اندر خواہشات بھی رکھی ہیں۔ تاکہ اس کا امتحان ہو۔ جب انسان خواہشات کو قابو میں رکھنے کے بجائے ان سے مغلوب ہو جاتا ہے، تو وہ

غلط فیصلے کر بیٹھتا ہے۔اور کفر کی راہ دراصل خواہشات کے غلبہ ہی کے نتیجہ میں اختیار کرتا ہے۔اور جب وہ خواہشات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو ان کے پردے اس کی عقل پر پڑ جاتے ہیں۔اور جب عقل پر خواہشات کے پردے پڑ جاتے ہیں تو سماعت و بصارت کی قوتیں جو عقل کو صحیح علم عطا کرنے کا ذریعہ ہیں تا کہ علم کی روشنی میں انسان کی رہنمائی کرے، معطل ہو کر رہ جاتی ہیں۔اور خواہشات کے یہ پردے جو عقل پر پڑ جاتے ہیں، درحقیقت جہالت کے پردے ہیں۔

۱۲۷۔ یہ اس سورہ کی اختتامی آیات ہیں، جن میں شرک اور انکار آخرت کے تعلق سے تنبیہ اور نصیحت کی گئی ہے۔

۱۲۸۔ یہ تنبیہ ہے ان لوگوں کو جو اللہ کو اپنا واحد کارساز ماننے کے، بجائے اس کے بندوں کو کارساز مانتے ہیں۔ان کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر قیامت برپا ہو ہی گئی تو یہ فرشتے جن کو ہم ''واسطہ اور وسیلہ'' بنائے ہوئے ہیں اللہ کے حضور ہماری نجات کے لئے سفارش کر دیں گے۔ان پر واضح کیا جا رہا ہے کہ یہ تمہاری محض خام خیالی ہے۔فرشتے یا ہمارے دوسرے نیک بندے تمہیں کیا بچا سکیں گے جب کہ ہم نے کافروں کی میزبانی کے لئے جہنم تیار کر رکھی ہے۔

واضح رہے کہ آدمی اگر آخرت کا قائل بھی ہو تو اللہ کے نیک بندوں کو کارساز ماننے کا عقیدہ وہ گمراہی ہے، جو خدا کے حضور جوابدہی کے احساس کو ختم کر دیتی ہے۔نتیجہ یہ کہ آدمی عمل کی جگہ فلاں اور فلاں کی کارسازی پر اعتماد کرنے لگتا ہے۔اس طرح آخرت کا عقیدہ بالکل معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنا کارساز بنایا ہے۔چنانچہ ''کفارہ'' کا عقیدہ اس کا واضح ثبوت ہے اور اس عقیدہ کے نتیجہ میں آخرت کو مانا نہ ماننے کے برابر ہو کر رہ گیا ہے۔

مسلمانوں میں بھی بگڑے ہوئے۔عقیدہ کے لوگ موجود ہیں۔کوئی حضرت علی اور حضرت حسین کو کارساز بنائے ہوئے ہے تو کوئی ''پیران پیر'' کو۔اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ فکر آخرت سے وہ بے پرواہ ہو گئے ہیں۔

۱۲۹۔ یعنی جنہوں نے آخرت کے بجائے دنیا کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے، جن کی ساری دوڑ دھوپ اپنی دنیوی زندگی کو ''شاندار'' بنانے کے لئے ہے۔مقصد کا صحیح تعین نہ کر کے انہوں نے اپنی زندگیوں کو بالکل غلط رخ پر ڈال دیا ہے۔اور اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ وہ بڑے اچھے کام کر رہے ہیں۔

آج بھی انسانی سوسائٹی کا بہت بڑا حصہ دنیا ہی کو مقصد حیات بنائے ہوئے ہے۔وہ اپنی انفرادی زندگی میں مفاد دنیا ہی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔اور اپنی اجتماعی زندگی میں بھی اسی کو غایت بناتے ہیں۔اگر وہ قوم کی خدمت کرتے ہیں تو اس لئے کہ ان کی دنیا بنے، وہ تعلیمی سرگرمیاں دکھاتے ہیں تو اس لئے کہ قوم کو علوم دنیا سے مالا مال کر دیں، وہ کوئی معاشی پروگرام بناتے ہیں تو اس لئے کہ لوگ خوشحالی کی زندگی بسر کریں۔غرضیکہ ان کے سارے کام دنیوی اور مادی ترقی کے لئے ہوتے ہیں۔اس سے بلند کوئی مقصد ان کے سامنے نہیں ہوتا کہ وہ تعمیر انسانیت کا کام کریں۔وہ اپنی ان خدمات کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں۔

کہو اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے گا قبل اس کے کہ میرے رب کی باتیں ختم ہوں، اگر چہ ہم اس جیسے اور سمندر کا اضافہ کریں۔ کہو میں تم ہی جیسا ایک بشر ہوں۔ مجھ پر وحی آتی ہے، کہ تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے۔ تو جو کوئی اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہو اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ (القرآن)

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾

۱۰۵ یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں اور اس کی ملاقات کا انکار کیا۔ لہٰذا ان کے اعمال اکارت گئے اور قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قائم نہ کریں گے۔ ۱۳۰؎

ذَٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ﴿١٠٦﴾

۱۰۶ یہ ان کی جزا ہوگی جہنم۔ اس لئے کہ انہوں نے کفر کیا تھا اور میری آیتوں اور رسولوں کو مذاق بنالیا تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾

۱۰۷ (البتہ) جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ان کی ضیافت کے لئے فردوس کے باغ ہوں گے۔ ۱۳۱؎

خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿١٠٨﴾

۱۰۸ جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہاں سے وہ کبھی جانا نہ چاہیں گے۔ ۱۳۲؎

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ﴿١٠٩﴾

۱۰۹ کہو اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے گا قبل اس کے کہ میرے رب کی باتیں ختم ہوں، اگرچہ ہم اس جیسے اور سمندر کا اضافہ کریں۔ ۱۳۳؎

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ﴿١١٠﴾

۱۱۰ کہو میں تم ہی جیسا ایک بشر ہوں۔ مجھ پر وحی آتی ہے، ۱۳۴؎ کہ تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے۔ تو جو کوئی اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہو اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ ۱۳۵؎

۱۳۰؎ دنیا کو اپنا نصب العین بنانے والے نہ خدا کی آیتوں کو مانتے ہیں اور نہ اس کے حضور پیشی کا یقین رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے تمام اعمال اور ان کے تمام کارنامے اکارت جانے والے ہیں۔ آخرت کی میزان میں وہ بالکل بے وزن ہوں گے۔ جب انہوں نے دنیا ہی کے لئے سب کچھ کیا تھا اور اس کا پھل بھی انہیں دنیا ہی میں مل گیا تھا۔ تو آخرت میں اس کا اجر انہیں کیوں ملے۔

۱۳۱؎ فردوس جنت ہی کا دوسرا نام ہے۔ باغوں کو اس کی طرف منسوب کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فردوس کا لفظ یہاں اس وسیع جنت کے لئے استعمال ہوا ہے جس میں بہت سے باغ ہوں گے۔

۱۳۲؎ یعنی جنت میں رہ کر وہ اُکتائیں گے نہیں کہ کسی اور جگہ منتقل ہونا چاہیں۔ بلکہ وہ پورے سکون و اطمینان اور مسرت و شادمانی کے ساتھ جنت میں رہیں گے اور ہمیشہ وہیں رہنا چاہیں گے۔

قرآن و سنت کی تصریحات سے جنت کا جو تصور قائم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت کی طرح ہے۔ ان میں درجوں کی بلندی ایسی ہے جیسے تارے جو نہایت بلندی پر نظر آتے ہیں۔ گویا جنت بجائے خود ایک وسیع عالم ہے اور اہل ایمان کی کوئی آرزو اور طلب ایسی نہ ہوگی جو وہاں پوری نہ ہو۔ اس لئے وہاں سے کہیں اور جانے یا منتقل ہونے کی وہ کبھی خواہش نہ کریں گے۔

۱۳۳؎ اشارہ ہے اس بات کی طرف، کہ اس سورہ میں اللہ کی قدرت کے جن عجائبات اور اس کی حکمت کے جن کرشموں کا ذکر ہوا ہے، وہ کلمات الٰہی میں سے چند ایک باتیں ہیں، جو غور و فکر اور سبق آموزی کے لئے پیش کر دی گئی ہیں۔ ورنہ اس کی باتیں اتنی ہیں کہ ضبط تحریر میں لانے کے لئے سمندروں کے بقدر روشنائی بھی کفایت نہ کرے۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ اگر ایک ذرہ کی خصوصیات پر ایک مقالہ لکھا جا سکتا ہے تو اس کائنات پر لکھنے کے لئے کتنے دفتر درکار ہیں؟ اس سے جو بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے وہ ہے اللہ کی عظمت، اس کے علم کی وسعت اور اس کی قدرت و حکمت کے کرشموں کے بے انتہا ہونا۔

اللہ کی عظمت کے اس تصور سے توحید کی راہ بھی روشن ہوتی ہے اور آخرت کا یقین بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

۱۳۴؎ مطلب یہ ہے کہ میں تمہاری طرح انسان ہی ہوں، البتہ جو امتیاز مجھے حاصل ہے وہ وحی کا ہے۔ وحی الٰہی مجھ پر آتی ہے، تم پر نہیں آتی اور وحی الٰہی ہی کی وجہ سے میں منصبِ رسالت پر معمور ہو گیا ہوں۔

قرآن کی اس صراحت کے باوجود مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ وہ تاویلات اور بے اصل روایتوں کا سہارا لے کر آپ کو فوق البشر (انسان سے بڑھکر) ثابت کر دکھانا چاہتا ہے۔ وہ اس بات میں عار محسوس کرتا ہے کہ آپ کو بشر کہا جائے۔ حالانکہ اسی سے آپ کی اس شان کا اظہار ہوتا ہے کہ ایک بشر کو نبوت و رسالت کا وہ اشرف مقام حاصل ہو گیا، جو دوسرے انسانوں سے اسے ممتاز کرتا ہے۔

نصاریٰ نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت میں غلو کیا تو انہیں نعوذ باللہ خدا کا بیٹا بنا دیا۔ معلوم ہوا کہ رسول کی شخصیت میں غلو کرنے سے گمراہی کی راہیں کھلتی ہیں۔

۱۳۵؎ اللہ کے الٰہ واحد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی اقتدار رکھنے والی ہستی (خدا) اللہ ہی ہے۔ اور معبود حقیقی (مستحقِ عبادت) بھی وہی ہے۔ اس لئے عبادت اسی کا حق ہے۔ اور جس طرح اللہ کے ساتھ اور خداؤں کا قائل ہونا شرک ہے، اسی طرح اس کی عبادت میں کسی اور کو شریک کرنا بھی شرک ہے۔ پہلا شرک عقیدہ کا ہے اور دوسرا شرک عمل کا۔ اور اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اپنے عقیدہ کو بھی شرک سے پاک رکھے اور عمل کو بھی۔

عبادت میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں ان کی صراحت قرآن نے موقع موقع سے کر دی ہے۔ مثلاً حاجت روائی کیلئے پکارنا، فریاد کرنا، نام کی مالا جپنا، خشوع و خضوع کے ساتھ جھکنا، خائف و لرزاں ہونا، التجائیں کرنا، پناہ ڈھونڈنا، دعائیں کرنا، نذر ماننا، تقرب چاہنا، جانور کو ذبح کرتے وقت نام لینا، قربانی پیش کرنا، نعمتوں کے حاصل ہو جانے پر شکر گذار ہونا، عاجزی کرنا، امیدیں وابستہ کرنا، شدید محبت کرنا، نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، صدقہ و خیرات کرنا، طواف اور مناسک ادا کرنا۔ غرضیکہ

پرستش کی تمام شکلیں عبادت میں داخل ہیں اور عبادت اللہ کے لئے خاص ہے۔

واضح رہے کہ اللہ کی عبادت کے ساتھ اس کی اطاعت لازم وملزوم ہے۔لیکن عبادت کو محض اطاعت قرار دینا عبادت کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔عبادت یا پرستش کا تعلق اس مخصوص جذبہ سے ہے، جو فطرت کے اندر ودیعت ہوا ہے اور اپنے ظہور کے لئے اس کا رخ ربِّ حقیقی ہی کی طرف ہے۔جب کہ اطاعت ایک ذہنی فیصلہ اور اعضاء وجوارح کا عمل ہے۔اوپر جو مثالیں پیش کی گئیں ان پر عرف عام میں بھی اور دینی اصطلاح میں بھی پرستش یا عبادت کا اطلاق ہوتا ہے نہ کہ اطاعت کا۔

دوسرا بڑا فرق عبادت واطاعت میں یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں۔جب کہ اطاعت شریعت کے دائرہ میں رہ کر انسانوں کی بھی کی جاسکتی ہے اور رسول کی اطاعت کا تو اللہ تعالیٰ نے صریح حکم دیا ہے۔جب کہ رسول کی عبادت نہ صرف یہ کہ جائز نہیں بلکہ شرک ہے۔

❑❑❑❑❑❑

۱۹۔ مریم

نام اس سورہ میں حضرت مریم اور ولادتِ مسیح کا قصہ بیان ہوا ہے۔اس مناسبت سے سورہ کا نام مریم قرار پایا ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے۔اور ہجرت حبشہ سے پہلے نازل ہوئی تھی۔

مرکزی مضمون واقعات کی روشنی میں نصاریٰ کے باطل عقائد کی تردید کرنا ہے۔اور ساتھ ہی مشرکین کو ان کی گمراہیوں پر متنبہ کرنا ہے۔اس میں دعوت کے تینوں اجزاء توحید، رسالت اور آخرت ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔

نظم کلام آیت ۱ حروف مقطعات پر مشتمل ہے۔

آیت ۲ تا ۱۵ میں حضرت یحییٰ کی ولادت کا قصہ بیان ہوا ہے، جو ولادتِ مسیح کے واقعہ کی تمہید ہے۔

آیت ۱۶ تا ۳۶ میں حضرت مریم اور ولادتِ مسیح کا قصہ بیان ہوا ہے۔

آیت ۳۷ تا ۴۰ میں نصاریٰ کو ان کے اختلافات پر متنبہ کیا گیا ہے۔

آیت ۴۱ تا ۵۰ میں حضرت ابراہیم کی دعوتِ توحید اور اس کے نتیجہ میں پیش آنے والا ہجرت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

آیت ۵۱ تا ۶۳ میں حضرت موسیٰ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہوا ہے۔جس سے ایک طرف سلسلۂ رسالت کو بیان کرنا مقصود ہے، اور دوسری طرف ان کی تعلیمات سے انحراف کرنے والوں کو ہلاکت سے آگاہ کرنا اور ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے والوں کو کامیابی کی خوشخبری دینا ہے۔

آیت ۶۴ تا ۶۶ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر واستقامت کی ہدایت ہے۔

آیت ۶۷ تا ۹۸ میں منکرین آخرت کے شبہات کو دور کرتے ہوئے ایمان ویقین پیدا کرنے والے احوال پیش کئے گئے ہیں۔

شاہ حبش کے دربار میں سورہ مریم کا سنایا جانا: مکہ میں جب مسلمانوں پر مشرکین کے مظالم بڑھ گئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ اگر تم حبش کی طرف نکل جاؤ تو اچھا ہے۔کیوں کہ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کی حکومت میں کوئی ظلم نہیں کرسکتا۔چنانچہ مسلمانوں کا ایک قافلہ حبش پہنچ گیا۔یہ نبوت کے پانچویں سال کا واقعہ ہے۔قریش نے بھی اپنا ایک وفد شاہ حبش کے پاس بھیجا تاکہ ان مہاجرین کو وہ واپس کردے۔وفد نے بادشاہ کو ہدیے اور نذرانے پیش کئے اور اس سے کہا کہ چند نوجوان ہمارے ملک سے بھاگ آئے ہیں۔انہوں نے اپنا دین بدل دیا ہے لہٰذا انہیں ہمارے حوالے کردیا جائے۔

بادشاہ نے جو نجاشی کہلاتا تھا اور عیسیٰ علیہ السلام کا پیروکار تھا، مہاجر مسلمانوں کا بلا بھیجا اور ان سے پوچھا کہ یہ تم نے کونسا دین اختیار کیا ہے؟ اس وقت حضرت جعفر بن ابی طالب نے بڑی مؤثر تقریر کی۔جس میں انہوں نے زمانۂ جاہلیت کے حالات بتلاتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کی ان خوبیوں کا ذکر کیا، جن کی وجہ سے ان کی زندگیاں بالکل بدل گئیں اور ان کے اندر بہترین اوصاف پیدا ہوئے۔نجاشی نے کہا مجھے اس کلام کا کچھ حصہ تو سناؤ جو تمہارے نبی پر نازل ہوا ہے۔حضرت جعفر نے سورۂ مریم کا ابتدائی حصہ سنایا۔نجاشی اس کلام کو سن کر رو پڑا اور دربار کے پادریوں پر بھی رقت طاری ہوگئی۔نجاشی نے کہا بلاشبہ یہ کلام اور جو کچھ حضرت عیسیٰ لائے تھے ایک ہی نور کی کرنیں ہیں۔پھر اس نے قریش کے قاصدوں سے کہا میں ان لوگوں کو ہرگز تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔اس نے ان کے ہدیے بھی یہ کہہ کر واپس کردئے کہ مجھے رشوت کی ضرورت نہیں ہے۔اور مسلمان مہاجرین سے کہا تم امن وچین سے رہ سکتے ہو۔

کلام الٰہی کی یہ وہ تاثیر تھی جس کے آگے شاہ وگدا سب بے بس تھے! (ہجرت حبشہ کا واقعہ تفصیل سے سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۴۳ تا ۳۶۴ میں بیان ہوا ہے۔)

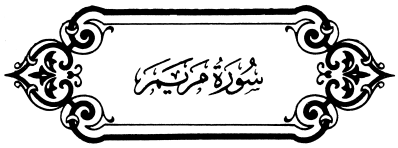

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كٓهٰيٰعٓصٓ ①

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ②

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ③

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ④

وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ⑤

يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۗ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ⑥

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اِسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ⑦

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ⑧

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ⑨

۱۹۔ سُورۃُ مریم

آیات ۹۸

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ کاف۔ہا۔یا۔عین۔صاد۔ا۔

۲ یہ تمہارے رب کی اس رحمت کا ذکر ہے جو اس نے اپنے بندے زکریا پر کی تھی۔ ۲۔

۳ جب اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔ ۳۔

۴ اس نے دعا کی اے میرے رب! میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں اور سر بڑھاپے سے سفید ہو گیا ہے اور اے میرے رب ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے تجھے پکارا ہو اور محروم رہا ہوں۔ ۴۔

۵ مجھے اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے اندیشہ ہے ۵۔ اور میری بیوی بانجھ ہے ۶۔ تو تُو خاص اپنی طرف سے مجھے وارث عطا کر۔ ۷۔

۶ جو میرا وارث بھی ہو اور آل یعقوب کا بھی۔ ۸۔ اور اے میرے رب، اسے پسندیدہ بنا۔ ۹۔

۷ اے زکریا! ہم تمہیں ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا ۱۰۔ ہم نے اس سے پہلے اس نام کا کوئی شخص پیدا نہیں کیا۔ ۱۱۔

۸ اس نے عرض کیا اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کی انتہاء کو پہنچ چکا ہوں! ۱۲۔

۹ فرمایا ایسا ہی ہوگا ۱۳۔ تمہارا رب فرماتا ہے کہ یہ میرے لئے آسان ہے۔ میں اس سے پہلے تمہیں پیدا کر چکا ہوں جب کہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ ۱۴۔

ا۔ یہ حروف مقطعات ہیں جن کے سلسلہ میں ضروری وضاحت سورۂ بقرہ نوٹ ا۔ اور سورۂ یونس نوٹ ا۔ میں کی جا چکی ہے۔ ان حروف کا اشارہ اس سورہ کے بعض اہم مضامین کی طرف ہے جس کی تفصیل یہ ہے:

''کاف'' کا اشارہ **کُن فَیَکُون** (وہ حکم دیتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ آیت ۳۵) کی طرف ہے اور مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ جو خدا اپنے ایک حکم سے کسی بھی چیز کو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ اس نے اگر عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، کہ اس کو خدا کا بیٹا قرار دیا جائے یا خدائی میں شریک ٹھہرایا جائے۔ اس سلسلۂ مضامین میں ''ک'' **کُن** (ہو جا) کیلئے ایک حرف علامت (Significant letter) ہے جو ذہن کو مذکورہ حقیقت کی طرف موڑتا ہے۔

ھا، کا اشارہ ''**ھیّن**'' (آسان) کی طرف ہے۔ آیت ۹ میں حضرت یحییٰ کی غیر معمولی پیدائش کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے: **قَالَ رَبُّکَ ھُوَ عَلَیَّ ھَیِّنٌ** (تمہارا رب فرماتا ہے کہ یہ میرے لئے آسان ہے۔ آیت ۹) اور پھر حضرت یحییٰ کی پیدائش ہو یا حضرت عیسیٰ کی، غیر معمولی طریقہ پر ان کو پیدا کرنا اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اس کی قدرت کے یہ ادنیٰ کرشمے ہیں۔

یا، کا اشارہ یحییٰ کی طرف ہے جن کا ذکر آیت ۷ تا ۱۵ میں ہوا ہے۔

''عین'' کا اشارہ عیسیٰ کی طرف ہے جن کا نام آیت ۳۴ میں آیا ہے اور جن کی ولادت کا ذکر اس سے پہلے کی آیات میں تفصیل سے ہوا ہے۔

''صاد'' کا اشارہ صَبیّا کی طرف ہے جس کے معنیٰ بچے کے ہیں۔ آیت ۱۲ میں حضرت یحییٰ کے بارے میں یہ اہم بات ارشاد ہوئی ہے کہ **وَآتَیْنَاہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا** (ہم نے اسے حکم یعنی حکمت عطاء کی جب کہ وہ ابھی بچہ تھے) اسی طرح آیت ۲۹ میں حضرت عیسیٰ کے بارے میں صبیّا (بچہ) کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور وہاں ان کے گہوارہ میں بات کرنے کا ذکر ہوا ہے۔ یعنی اللہ کے اس معجزہ کا ذکر ہے کہ عیسیٰ کو اس نے جبکہ وہ گہوارہ میں صبی یعنی بچہ تھے گویائی عطا فرمائی۔ (اور اللہ ہی اپنے کلام کے اسرار بہتر جانتا ہے)۔

۲۔ حضرت زکریا انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں اور ان کا زمانہ حضرت مسیح کی ولادت سے پہلے کا ہے۔ ولادت مسیح کے بعد بھی وہ ایک عرصہ تک زندہ رہے۔

۳۔ دعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ بندہ جب اپنے لئے دعا کرے تو چپکے چپکے کرے، تاکہ وہ ریا اور نمائش سے پاک ہو اور اپنے رب کے سامنے اپنے دل کی باتوں کو پیش کر سکے۔

۴۔ حضرت زکریا نے جس وقت اولاد کے لئے دعا کی اس وقت وہ کافی بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی ہڈیاں تک کمزور ہو گئی تھیں اور سر کے بال بھی سفید ہو گئے تھے۔ بڑھاپے کی اس عمر میں اولاد کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ مگر انہوں نے اللہ سے پُر امید ہو کر دعا کی کہ وہ اپنی خاص عنایت سے انہیں نوازے۔ یہ دعا ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی۔ اور شکر کے جذبات کے ساتھ تھی کہ خدایا جب کبھی میں نے تجھے پکارا ہے تیرے در سے نامراد نہیں لوٹا ہوں۔ یہ دعائیہ کلمات اللہ کی رحمت کے جوش میں آنے کے لئے نہایت موزوں تھے۔

۵۔ اندیشہ اس بات کا کہ کوئی شخص دینی رہنمائی اور قیادت کے منصب کو سنبھالنے والا نہیں ہے۔ واضح رہے کہ بنی اسرائیل میں دینی رہنمائی اور نبوت کا منصب ان کے ایک قبیلہ بنی لاوی میں چلا آ رہا تھا۔ اور حضرت زکریا کے زمانہ میں بنی اسرائیل جس انحطاط میں مبتلا تھے اس کے پیش نظر اس منصب کا اہل کوئی نظر نہ آتا تھا۔ اس لئے حضرت زکریا کو فکر ہوئی کہ ان کے بعد بنی اسرائیل کی رہنمائی و قیادت کا کیا انتظام ہوگا۔

۶۔ لوقا کی انجیل میں ہے: ''یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیّاہ کے فریق میں سے زکریاہ نام ایک کاہن (ایک مذہبی عہدہ رکھنے والا) تھا اور اس کی بیوی ہارون، کی اولاد میں سے تھی جس کا نام الیشبع تھا۔ اور وہ دونوں خدا کے حضور استباز اور خداوند کے سب احکام و قوانین پر بے عیب چلنے والے تھے۔

ان کے اولاد نہ تھی کیوں کہ الیشبع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے۔'' (لوقا ۱:۵ تا ۷)

۷۔ مراد اولاد ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران آیت ۳۸ میں **ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً** (پاکیزہ اولاد) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

۸۔ وارث سے مراد سرمایۂ دین اور علم نبوت کا وارث ہے۔ چنانچہ ''آل یعقوب کا وارث'' کے الفاظ اس مفہوم کی صراحت کرتے ہیں۔

جہاں تک مالی وراثت کا تعلق ہے انبیاء علیہم السلام نہ اس مقصد کیلئے مال جمع کرتے ہیں اور نہ انہیں اس کی فکر ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے انبیاء کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔:

لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ (بخاری کتاب الجہاد) ''ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔'' البتہ انہیں اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ ان کے بعد علم دین کی امانت کا کون اہل ہوگا اور قوم کی دینی رہنمائی وقیادت کے لئے کوئی موزوں فرد ہے یا نہیں۔

۹۔ یعنی دین، اخلاق اور سیرت کے اعتبار سے اسے اپنا پسندیدہ بنا۔

۱۰۔ یہ خوشخبری اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا کو دی۔ اور جیسا کہ سورۂ آل عمران آیت ۳۹ میں بیان ہوا ہے، یہ خوشخبری اللہ کی طرف سے فرشتوں نے سنائی تھی، جب کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔

یحییٰ کے لفظی معنیٰ ہیں ''وہ زندہ رہے گا۔'' یہ نام اللہ نے رکھا تھا جو ظاہر ہے حکمت سے خالی نہیں ہوسکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت یحییٰ کو حق گوئی کی بنا پر یہود یہ کے حکمراں ہیرودوس نے ایک رقاصہ کی فرمائش پر قتل کر دیا تھا۔ اس طرح وہ راہِ حق میں شہید ہوگئے، اور شہید ہونے والے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے مرتے نہیں بلکہ زندہ رہتے ہیں۔ (سورۂ بقرہ آیت ۱۵۴) اس لئے حضرت یحییٰ مر کر زندہ جاوید ہوگئے گویا ان کے نام ہی میں یہ بات مضمر تھی، کہ یہ شخصیت زندہ جاوید ہونے والی ہے۔ اس طرح واقعات نے نام کی معنویت ظاہر کر دی۔

۱۱۔ متن میں لفظ سَمِیًّا استعمال ہوا ہے جس کے ایک معنیٰ تو ''ہم نام'' کے ہیں، اور دوسرے معنیٰ نظیر کے ہیں۔ پہلے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ یہ ایک انوکھا نام ہے۔ اس سے پہلے کسی کا بھی یہ نام نہیں رکھا گیا تھا۔ اور دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ یحییٰ کی شخصیت کچھ امتیازی اوصاف اور خصوصیات کی بنا پر ایک بے نظیر شخصیت ہوگی۔ چنانچہ ان کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی ولادت غیر معمولی طریقہ پر ہوئی۔ ان کے والدین نہ صرف بوڑھے ہوگئے تھے، بلکہ ان کی والدہ بانجھ بھی تھی۔ اس کے باوجود ان کی ولادت ہوئی۔ دوسری یہ کہ ان کو بچپن ہی میں حکمت عطاء ہوئی۔ تیسری یہ کہ ان میں کمال درجہ کا ضبطِ نفس تھا۔ (حصورًا) چنانچہ وہ دنیا کی لذتوں سے زندگی بھر ناآشنا رہے۔

بائبل میں ان کا یہ حال بیان ہوا ہے کہ: ''یہ یوحنا'' (یعنی یحییٰ) اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کا پٹکا اپنی کمر سے باندھے رہتا تھا اور اس کی خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد تھا۔'' (متی ۳:۴)

اور یہ سادہ زندگی انہوں نے مقصد حق کی لگن میں بسر کی۔ ان پر ایک ہی دھن سوار تھی اور وہ یہ کہ لوگ اللہ کی طرف رجوع کریں۔ اس مقصد کے لئے وہ قریہ قریہ جاتے اور بیابان کی خاک چھانتے۔

۱۲۔ یہ سوال بطور شک کے نہیں تھا بلکہ مزید اطمینان حاصل کرنے کیلئے تھا، کہ جس لڑکے کی ان کو خوشخبری دی جارہی ہے اس کی ولادت کی کیا صورت ہوگی۔

۱۳۔ یعنی تمہارے بڑھاپے کے باوجود اور تمہاری بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود تمہارے ہاں لڑکا پیدا ہوگا۔

۱۴۔ یعنی جس خدا نے تم کو عدم سے وجود میں لایا اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ تمہیں بڑھاپے میں اور تمہاری بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود اولاد بخشے۔

حضرت یحییٰ کی غیر معمولی طریقہ پر پیدائش کا یہ واقعہ دراصل تمہید ہے حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے واقعہ کی، جو بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔اس سے اصلاً یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اگر غیر معمولی پیدائش کی بنا پر حضرت یحییٰ خدا یا خدا کا بیٹا قرار نہیں پائے، تو حضرت مسیح اپنی غیر معمولی پیدائش کی بنا پر خدا یا خدا کا بیٹا کیسے قرار پا سکتے ہیں؟ اللہ کی قدرت کے کرشموں کا ظہور تو مختلف شکلوں میں ہوتا ہی رہا ہے پھر جو کرشمۂ قدرت حضرت عیسیٰ کے بارے میں ظاہر ہوا، اس کو ان کے ابن اللہ ہونے پر محمول کرنا کیا معنیٰ؟

واضح رہے کہ لوقا کی انجیل میں بھی تمہید کے طور پر حضرت یحییٰ کی ولادت کا واقعہ بیان ہوا ہے۔

❑❑❑❑❑❑

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ
اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝۱۰

۱۰ اس نے عرض کیا، اے میرے رب! میرے لئے کوئی نشانی مقرر کر دے ۱۵۔ فرمایا تمہارے لئے نشانی یہ ہے کہ تم تین شب و روز لوگوں سے بات نہ کر سکو گے۔ ۱۶۔

فَخَرَجَ عَلٰي قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ
سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۝۱۱

۱۱ پھر وہ عبادت کے حجرہ سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا اور ان سے اشارہ سے کہا کہ صبح و شام تسبیح کرو۔ ۱۷۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝۱۲ۙ

۱۲ اے یحییٰ! کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لو ۱۸۔ اور ہم نے اس کو بچپن ہی میں حکمت عطا فرمائی۔ ۱۹۔

وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ۝۱۳ۙ

۱۳ اور خاص اپنے پاس سے نرم دلی، ۲۰۔ اور پاکیزگی ۲۱۔ اور وہ بڑا پرہیزگار تھا۔ ۲۲۔

وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝۱۴

۱۴ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا تھا۔ خودسر و نافرمان نہ تھا۔ ۲۳۔

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝۱۵ۧ

۱۵ سلامتی ہے اس پر جس دن وہ پیدا ہوا، اور جس دن وہ مرے گا اور جس دن زندہ اٹھایا جائے گا۔ ۲۴۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا
مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝۱۶ۙ

۱۶ اور (اے پیغمبر!) کتاب میں مریم کا ذکر کرو ۲۵۔ جب کہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر مشرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی۔ ۲۶۔

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۡ فَاَرْسَلْنَآ
اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝۱۷

۱۷ پھر اس نے ان سے پردہ کر لیا ۲۷۔ تو ہم نے اسکے پاس اپنی روح (فرشتہ) کو بھیجا اور وہ اس کے سامنے ٹھیک آدمی کی شکل میں ظاہر ہو گیا۔

قَالَتْ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝۱۸

۱۸ وہ بول اٹھی اگر تو خدا سے ڈرنے والا ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔ ۲۸۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ڰ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝۱۹

۱۹ اس نے کہا میں تو تمہارے رب کا فرستادہ ہوں، تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔ ۲۹۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ
يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ۝۲۰

۲۰ وہ بولی میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا جب کہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں اور نہ میں بدکار ہوں۔ ۳۰۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً
لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝۲۱

۲۱ اس نے کہا ایسا ہی ہوگا ۳۱۔ تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے آسان ہے۔ اور ہم یہ اس لئے کریں گے کہ اس کو لوگوں کیلئے ایک نشانی بنائیں ۳۲۔ اور اپنی طرف سے رحمت ۳۳۔ اور یہ بات طے پا چکی ہے۔ ۳۴۔

۱۵۔ نشانی انہوں نے اس لئے طلب کی تا کہ جس بات کی خوشخبری انہیں دی گئی ہے، اس کے وجود میں آنے کا ٹھیک ٹھیک وقت انہیں معلوم ہوجائے اور وہ ذکر الٰہی میں مشغول ہوجائیں۔

۱۶۔ اس کی تشریح سورہ آل عمران نوٹ ۶۱ میں گزر چکی۔ سَوِیًّا یعنی صحت مند ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ تین دن تک حضرت زکریا کا بات نہ کرسکنا گونگے پن یا کسی مرض کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ یہ ایک غیر معمولی حالت تھی جس میں وہ تسبیح تو کرسکتے تھے، لیکن بات نہیں کرسکتے تھے۔

۱۷۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اللہ کی طرف سے ایک غیر معمولی واقعہ ظہور میں آنے والا ہے، لہٰذا اس کی تسبیح میں سرگرم ہوجاؤ۔ واضح ہوا کہ تسبیح کرنا (اللہ کی پاکی بیان کرنا) عظیم عبادت ہے اور اس کا صبح وشام اہتمام کرنا اللہ کے نزدیک نہایت پسندیدہ عمل ہے۔ اس عبادت کی قدر وہی لوگ گھٹاتے ہیں جو دین کی اقدار (Values) کے معاملہ میں بے بصیرت ہوتے ہیں۔

۱۸۔ طرز کلام سے واضح ہے کہ جس طرح بشارت دی گئی تھی، یحییٰ کی ولادت ہوئی۔ اور بعد میں انہیں نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ کتاب سے مراد تورات ہے اور اس کو مضبوطی سے پکڑنے کا مطلب اس پر پختہ ایمان رکھنا اور صحیح طور سے اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔ اس سے یہ بات آپ ہی واضح ہورہی ہے کہ حضرت یحییٰ کے زمانہ میں تورات کا ایک حصہ اپنی اصل شکل میں محفوظ تھا۔ اسی لئے اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کا حکم دیا گیا۔

۱۹۔ یہ حضرت یحییٰ پر اللہ کا فضل خاص ہوا کہ ان کو بچپن ہی میں اس نے حکمت سے نوازا، یعنی انہیں سمجھ اور دانائی عطا کی۔

۲۰۔ نرم دلی (رقتِ قلب) وہ اعلیٰ صفت ہے جو انسان کو نصیحت قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہے، نیز اس سے نفس میں سوز وگداز پیدا ہوجاتا ہے جس سے انسان دوسروں کے درد کی چوٹ اپنے جگر میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ چیز اسے ہمدردِ انسانیت بناتی ہے اور وہ بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ حضرت یحییٰ میں اللہ کے فضل سے یہ صفت بدرجۂ کمال موجود تھی۔

۲۱۔ یعنی نفس کی پوری طہارت۔ ہر قسم کے باطنی امراض سے پاک۔ بالکل قلب مصفا۔

۲۲۔ یعنی جس طرح باطن میں پاک صاف تھا اسی طرح ظاہر میں بھی پرہیزگار تھا۔ اللہ سے ڈرتے ہوئے اس کی شریعت کے مطابق زندگی گذارنے والا۔

۲۳۔ بندگانِ خدا میں پہلا اور سب سے بڑا حق والدین کا ہے۔ جو شخص ان کے ساتھ بھلائی نہیں کرتا اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ دنیا کے ساتھ بھلائی کرے گا۔ اور جو شخص ان کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے وہ نیکی کی پرورش کا سامان کرتا ہے۔ اس لئے اس سے بجا طور پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بندگانِ خدا کے ساتھ بھی بھلائی کرے گا۔ بنی اسرائیل میں اس وقت جو بگاڑ پیدا ہوا تھا اس کی وجہ سے ان کے اندر سے یہ بنیادی صفت غائب ہوگئی تھی۔ وہ لوگوں پر ظلم کرنے والے اور حکم الٰہی کی خلاف ورزی کرنے والے بن گئے تھے۔ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ کو مذکورہ اوصاف کے ساتھ مبعوث کرکے ان کے سامنے سیرت کا نمونہ رکھ دیا، تا کہ ان میں احساس ابھرے اور وہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔

۲۴۔ یعنی دنیا نے اس کے ساتھ جو بھی سلوک کیا ہو مگر اللہ کی طرف سے اس پر سلامتی ہی سلامتی ہے۔ وہ سلامتی کے ساتھ دنیا میں آیا اور سلامتی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا اور قیامت کے دن بھی سلامتی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ ایسی عظیم شخصیت کی جنہوں نے ناقدری کی انہوں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنی ہی تباہی کا سامان کیا۔

۲۵۔ اس ذکر کی اہمیت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب کہ آدمی موجودہ انجیلوں کا تقابلی مطالعہ کرتا ہے اور ان میں اس واقعہ کی اہم کڑیوں کو غائب پاتا ہے۔ قرآن نے حضرت مریم کی عفت اور حضرت مسیح کی ولادت کے تمام اہم پہلوؤں کو اس طرح محفوظ کردیا ہے، کہ واقعہ کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے اور بیان کی صداقت یقین کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔

لوقا کی انجیل میں قدرے تفصیل سے حضرت مریم کا ذکر ہوا ہے لیکن دوسری انجیلوں میں بس سرسری طور سے ہی ہوا ہے۔

۲۶۔ جیسا کہ سورۂ آل عمران آیت ۳۵ میں بیان ہوا، حضرت مریم کو ان کی والدہ نے عبادت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس لئے وہ بیت المقدس میں ہیکل کے ایک مشرقی حصہ میں ایک حجرہ میں عزلت نشین ہو کر عبادت میں مشغول ہو گئیں۔

چونکہ ان کی عبادت کی جگہ ہیکل کے مشرقی حصہ میں تھی اس لئے نصاریٰ نے مشرقی جہت کو اپنا قبلہ قرار دیا اور یہ ان کی اپنی اختراع (بدعت) ہے۔

۲۷۔ یعنی ہیکل کے جس حصہ میں وہ گوشہ نشین ہو گئی تھیں وہاں انہوں نے پردہ ڈال دیا تھا، تاکہ لوگ اسے دیکھنے نہ پائیں اور وہ یکسوئی کے ساتھ عبادت کر سکے۔

معلوم ہوتا ہے ہیکل میں حجرہ (محراب) اس طرح بنا ہوا تھا کہ اس کو دروازہ نہیں تھا۔ اس لئے پردہ ڈال کر لوگوں کی نگاہوں سے اپنے کو محفوظ کر لیا تھا۔ دروازہ نہ ہونے اور صرف پردہ ڈالے رہنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی زندگی ایک کھلی کتاب بن گئی۔ ان کی پاک دامنی پر حرف رکھنے کے لئے کسی کو کوئی گنجائش نہ رہی۔

۲۸۔ حضرت مریم کا ایک اجنبی شخص کو حجرہ میں دیکھ کر گھبرا جانا ایک فطری بات تھی، اور انہوں نے اس کو اللہ سے ڈراتے ہوئے رحمٰن کی پناہ جو طلب کی تو وہ ان کے پاک دامن ہونے کا بین ثبوت ہے۔

۲۹۔ لوقا کی انجیل میں ہے: ''اور اس کنواری کا نام مریم تھا۔ اور فرشتہ نے اس کے پاس اندر آ کر کہا سلام تجھ کو جس پر فضل ہوا ہے۔ خداوند تیرے ساتھ ہے۔ وہ اس کلام سے بہت گھبرائی اور سوچنے لگی کہ یہ کیسا کلام ہے۔ فرشتہ نے اس سے کہا اے مریم! خوف نہ کر کیوں کہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے۔ اور دیکھ تو حاملہ ہو گی اور تیرے بیٹا ہو گا اس کا نام یسوع رکھنا۔'' (لوقا ۱: ۲۷ تا ۳۰)

۳۰۔ انجیل میں ہے: ''مریم نے فرشتہ سے کہا یہ کیوں کر ہو گا جب کہ میں مرد کو نہیں جانتی۔'' (لوقا ۱: ۳۴)

۳۱۔ یعنی کنواری ہونے کے باوجود تمہارے ہاں لڑکا پیدا ہو گا۔ قرآن کی یہ صراحت اس بارے میں ادنیٰ شبہ کیلئے بھی گنجائش نہیں چھوڑتی کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش بغیر باپ کے کنواری ماں سے ہوئی تھی۔ اور یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا معجزہ تھا۔

رہا بائبل کا یہ بیان کہ حضرت مریم کی منگنی یوسف نام کے ایک شخص سے ہوئی تھی۔ تو یہ محض جھوٹ ہے، جو انجیل میں داخل کر دیا گیا ہے۔ حضرت مریم کو تو ان کی والدہ نے عبادت کیلئے وقف کیا تھا۔ اسی لئے وہ ہیکل کے ایک حصہ میں گوشہ نشین ہو گئی تھیں۔ لہٰذا ان کے نکاح کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ پھر بائبل میں ایک جگہ کچھ کہا گیا ہے اور دوسری جگہ کچھ۔ متی کی انجیل میں یوسف کو مریم کا شوہر کہا گیا ہے (متی باب ۱:۱۶) جب کہ لوقا کی انجیل یوسف کو مریم کا منگیتر بتلاتی ہے۔ (لوقا ۲:۵) اور دوسری جگہ حضرت عیسیٰ کو یوسف کا بیٹا بھی کہا گیا ہے۔ (لوقا ۳:۲۳) اب اگر یوسف مریم کا منگیتر تھا تو محض منگنی کی بنا پر حضرت عیسیٰ اس کے بیٹے کیوں کر ہوئے؟ اور اگر نکاح ہو چکا تھا تو یوسف کو منگیتر کہنے کے کیا معنیٰ؟ اور کیا یہ بات ایک کنواری کے حاملہ ہونے کو مشکوک نہیں بناتی؟ بائبل کی اس تضاد بیانی کو اس کے شارح نے بھی محسوس کیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"Furthermore. the Genealogy here is not in agreement with that in luke 3:23- 38. Actually the genealogy in Matt. is that of Joseph, who is represented as Mary's husband rather than as the actual father of Jesus (V 5.16)" (The Interpreter's Commentary on the Bible p.610)

یہ ہے بائبل کی تضاد بیانی جو حضرت مریم کے کنواری ہونے کی حالت میں حاملہ ہونے کو مشکوک بنا دیتی ہے بخلاف اس کے قرآن کا بیان صاف ہے کہ حضرت مریم عبادت کیلئے وقف تھیں، وہ اپنے لوگوں سے بھی الگ ہو کر عبادت کے لئے گوشہ نشین ہو گئی تھیں اور کنواری تھیں کہ کسی مرد نے انہیں چھوا تک نہیں تھا۔ یہ اللہ کا معجزہ تھا کہ اس حالت میں وہ حاملہ ہو گئیں۔

۳۲۔ یعنی عیسیٰ کی ولادت معجزانہ طریقہ پر ہوا اور اس بنا پر وہ اس کی قدرت کی نشانی قرار پائیں۔

۳۳۔ یعنی عیسیٰ کا وجود اللہ کی رحمت کا فیضان ہو گا۔ کتنے ہی لوگ ان سے ہدایت پا کر رحمت الٰہی کے مستحق بنیں گے۔

۳۴۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فیصلہ ہو چکا ہے لہٰذا یہ بات ہو کر رہے گی۔

پھر اسے درد زہ کھجور کے تنے کے پاس لے گیا۔ وہ کہنے لگی کاش! میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور بھولی بسری بن گئی ہوتی۔ اس وقت فرشتہ نے اسے نیچے سے پکارا غمگین نہ ہو۔ تمہارے رب نے تمہارے نیچے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے۔ اور کھجور کے تنے کو پکڑ کر اپنی طرف ہلا لو۔ تر و تازہ کھجوریں تم پر جھڑ پڑیں گے۔ پس کھاؤ اور پیو اور (اپنی) آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ پھر اگر کوئی آدمی نظر آئے تو کہہ دو میں نے رحمٰن کے لئے روزہ کی نذر مانی ہے اس لئے آج کسی انسان سے بات نہیں کروں گی۔ (القرآن)

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾

۲۲ پھر اس کے حمل ٹھہر گیا اور وہ اس کو لئے ہوئے دور کے مقام کو چلی گئی۔ ۳۵؎

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾

۲۳ پھر اسے دردزہ کھجور کے تنے کے پاس لے گیا۔ وہ کہنے لگی کاش! میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور بھولی بسری بن گئی ہوتی۔ ۳۶؎

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾

۲۴ اس وقت فرشتہ نے اسے نیچے سے پکارا غمگین نہ ہو۔ تمہارے رب نے تمہارے نیچے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے۔ ۳۷؎

وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾

۲۵ اور کھجور کے تنے کو پکڑ کر اپنی طرف ہلا لو۔ تر و تازہ کھجوریں تم پر جھڑ پڑیں گے۔ ۳۸؎

فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾

۲۶ پس کھاؤ اور پیو اور (اپنی) آنکھیں ٹھنڈی کرو ۳۹؎۔ پھر اگر کوئی آدمی نظر آئے تو کہہ دو میں نے رحمٰن کے لئے روزہ کی نذر مانی ہے اس لئے آج کسی انسان سے بات نہیں کروں گی۔ ۴۰؎

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـــًٔا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾

۲۷ پھر وہ اس کو لئے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی۔ لوگ کہنے لگے اے مریم! تو نے یہ عجیب حرکت کی۔ ۴۱؎

يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾

۲۸ اے ہارون کی بہن! ۴۲؎ نہ تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بدکار عورت تھی۔ ۴۳؎

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۭ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾

۲۹ اس نے اس (بچہ) کی طرف اشارہ کیا ۴۴؎۔ لوگوں نے کہا ہم اس سے کیا بات کریں جو ابھی گہوارہ میں بچہ ہے۔ ۴۵؎

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۣ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾

۳۰ بچہ بول اٹھا۔ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا۔ ۴۶؎

وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿۳۱﴾

۳۱ اور مجھے بابرکت کیا جہاں کہیں بھی میں رہوں۔ ۴۷؎ اور اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک میں زندہ رہوں۔ ۴۸؎

وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾

۳۲ اور اس نے مجھے اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا بنایا ۴۹؎۔ سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔

وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾

۳۳ سلامتی ہے مجھ پر جس دن پیدا ہوا، اور جس دن میں مروں گا اور جس دن زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔ ۵۰؎

۳۵۔ مراد بیت لحم ہے جو یروشلم سے آٹھ نو میل کے فاصلہ پر ہے۔ بائبل میں اس مقام کو حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش بتلایا گیا ہے۔

۳۶۔ حضرت مریم نے کسی سے کوئی شکوہ شکایت نہیں کی اور نہ بے صبری کا مظاہرہ کیا۔ وہ اس خیال سے پریشان تھیں کہ لوگ چونکہ حقیقت حال سے واقف نہیں ہیں اس لئے اس پر تہمت لگائیں گے۔ ایک عفت مآب خاتون کے لئے اس کا تصور ہی ایسا تھا کہ اس کے ہوش وحواس کو متاثر کر کے رکھ دے۔ اس اندیشہ کے پیش نظر ان کی زبان سے یہ کلمات نکل گئے کہ کاش میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور میری یاد بھی لوگوں کے ذہنوں سے فراموش ہو چکی ہوتی۔ ان کے یہ معصومانہ جذبات تھے جن کا اظہار انہوں نے اپنے رب ہی کے حضور کیا تھا۔

۳۷۔ اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر ایک چشمہ نیچے کی جانب جاری کر دیا تھا۔ اس لئے فرشتہ نے وہاں سے آواز دی کہ دیکھو، جب تم پر اللہ کی عنایات کا یہ حال ہے کہ تمہارے لئے پانی کا چشمہ جاری کر دیا تو تمہیں فکر کس بات کی ہے؟ جب خدا ہی تمہارے ساتھ ہے تو دنیا تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ تسلی کا یہ سامان تھا جو حضرت مریم کے غم کو غلط کرنے کے لئے کیا گیا۔

۳۸۔ یعنی کھجور کے تنے کو ذرا سا ہلانا اس بات کیلئے کافی ہے کہ وہ تمہاری تواضع کیلئے تازہ اور پکی کھجوریں ٹپکائے۔ اس طرح حضرت مریم کیلئے ایک ایسی جگہ جہاں اس کی مدد کیلئے کوئی نہیں تھا کھانے پینے کا غیر معمولی انتظام کیا گیا۔ ایک طرف مریم کا توکل تھا اور دوسری طرف اللہ کی شان رحمت!

۳۹۔ یعنی بچہ کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرو کہ ایک نہایت پاکیزہ اور جلیل القدر شخصیت نے جنم لیا ہے۔

۴۰۔ معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل میں چُپ کا روزہ رکھا جاتا تھا اور نذر کے طور پر اس قسم کا روزہ رکھنا ان کیلئے روا تھا۔ حضرت مریم کو جس صورت حال سے واسطہ تھا اس کے پیش نظر انہیں ہدایت کہ وہ بطور نذر کے خاموشی کا روزہ رکھ لیں، بڑی حکیمانہ بات تھی۔ کیوں کہ معترضین کو مطمئن کرنا آسان نہ تھا ان پر حقیقت حال واضح کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے بچہ کو گویائی عطا فرمائی جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ واضح رہے کہ نذر کے معنیٰ کسی چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینے کے ہیں۔ (لسان العرب ج ۵ ص ۲۰۰) رہا یہ سوال کہ حضرت مریم اس وقت نفاس سے ہونگی اور روزہ ایک عبادت ہے تو اس حالت میں انہوں نے روزہ کس طرح رکھا ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نفاس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ایک مہینہ یا چالیس دن جاری رہے۔ کسی کے نفاس کی مدت بہت تھوڑی ہوتی ہے چنانچہ فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے۔ مغنی میں ہے:

ولیس لاقله حدای وقت رأت الطهر اغسلت۔ (مغنی ج ۱ ص ۳۴۷)

''نفاس کے خون کی کم سے کم مدت کے لئے کوئی حد نہیں ہے۔ عورت جس وقت بھی طہر کی حالت دیکھ لے غسل کر لے''

مطلب یہ ہے کہ نفاس کا خون ایک آدھ روز میں بھی بند ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ولادت میں نفاس کا خون سرے سے جاری ہی نہ ہو۔

۴۱۔ حضرت مریم جب بچہ کو گود میں لئے ہوئے اپنی قوم کے پاس پہنچی، تو لوگوں نے اعتراض کی بوچھار کر دی۔ وہ تہمت لگا رہے تھے کہ مریم گناہ کی مرتکب ہوئی ہے۔

۴۲۔ حضرت مریم حضرت ہارون کے خاندان سے تھیں جو پیغمبر تھے اسلئے لوگوں نے انہیں ہارون کی بہن کہہ کر پکارا۔ ورنہ حضرت مریم کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ عربی زبان میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً قبیلۂ ہمدان کے شخص کو وہ **یااخاهمدان** (اے ہمدان کے بھائی) کہہ کر پکارتے ہیں۔ حضرت مریم کو حضرت ہارون کی بہن کہہ کر لوگوں نے انہیں یہ احساس دلانا چاہا کہ تم ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہو جو ایک مشہور پیغمبر کا گھرانہ ہے۔ اسلئے تم سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ ایسی حرکت کرو گی۔ عام طور سے مفسرین نے ہارون سے پیغمبر ہارون نہیں بلکہ حضرت مریم کا کوئی بھائی مراد لیا ہے۔ ان کا استدلال مغیرہ بن شعبہ کی ایک روایت سے ہے جسمیں نبی ﷺ نے نجران کے عیسائیوں کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ حضرت ہارون تو حضرت مریم سے سیکڑوں برس پہلے گذر چکے تھے۔ پھر مریم کو ہارون کی بہن کس طرح کہا گیا۔ ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل اپنے نام انبیاء اور صالحین کے نام پر رکھتے تھے۔ یہ حدیث مسلم، ترمذی وغیرہ میں بیان ہوئی ہے۔ لیکن یہ حدیث اس بارے میں صریح نہیں ہے کہ حضرت مریم کا کوئی بھائی ہارون نامی تھا، دوسرے یہ کہ اس حدیث کا ایک راوی سماک بن حرب ہے جس کے بارے

میں محدثین کی رائیں مختلف ہیں۔کوئی ان کو ثقہ قرار دیتا ہے اور کوئی ضعیف۔سفیان اور شعبہ انہیں ضعیف قرار دیتے ہیں اور امام احمد کہتے ہیں وہ مضطرب الحدیث ہیں یعنی ان کی حدیثوں میں اضطراب (الجھاؤ) پایا جاتا ہے۔(میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۳۲۔۲۳۳) اور ابن حبان کہتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں لیکن بہ کثرت غلطیاں کرتے ہیں۔(تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۳۴)

۴۳۔ یہ اس بات کا اعتراف تھا کہ حضرت مریم نہایت شریف گھرانے کی خاتون ہیں۔

۴۴۔ حضرت مریم نے اللہ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے خاموشی کا روزہ رکھا تھا۔اس لئے لوگوں کو کوئی جواب نہیں دیا بلکہ بچہ کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے بات کرو۔

۴۵۔ یعنی جو بچہ ابھی گہوارہ میں ہو اس سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں؟

۴۶۔ نوزائیدہ بچے کا بول اٹھنا اللہ کی طرف سے معجزہ تھا۔یہ معجزہ اللہ تعالیٰ نے اس لئے دکھایا تا کہ یہ حضرت مریم کے پاکدامن ہونے کی دلیل ہو اور انہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا نہ پڑے، نیز حضرت عیسیٰ کی نبوت کی نشانی قرار پائے۔

گہوارہ میں ان کا یہ اعلان کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس حقیقت کا اظہار تھا کہ ان کا مقام عبدیت کا مقام تھا نہ کہ اس سے مختلف کچھ اور۔یہ ان کو اللہ کا بیٹا قرار دئے جانے کی پیشگی تردید تھی۔

کتاب سے مراد انجیل ہے۔''کتاب دی اور نبی بنایا'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گہوارہ میں حضرت عیسیٰ کو کتاب دی گئی تھی اور نبوت کا منصب عطا کیا گیا تھا۔یہ چیزیں تو ان کو اس وقت عطا ہوئیں جب کہ وہ ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے قابل ہوئے۔لیکن چونکہ یہ اللہ کا فیصلہ تھا اس لئے اس کو لامحالہ وقوع میں آنا تھا۔اس بنا پر بچہ کی زبان سے اس طرح اعلان کرا دیا گیا کہ گویا یہ چیزیں عطا ہو ہی گئی ہیں۔یہ اسلوب بیان وقوع میں آنے والی کسی چیز کی قطعیت کو ظاہر کرتا ہے۔

اس معجزہ کا ذکر موجودہ انجیلوں میں نہیں ہے اس کی وجہ وہ حالات ہیں جن میں یہ انجیلیں مرتب ہوئی ہیں۔یہود جو اس واقعہ کے اصل شاہد تھے حضرت مسیح کے منصب نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد ان کے دشمن بن گئے۔اور جو لوگ ان کے پیرو بن گئے ان کو بڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑا، اس لئے ان پُرفتن حالات میں حضرت مسیح کے حالات زندگی اور ان کی تعلیمات کا بڑا حصہ محفوظ نہ رہ سکا۔لیکن قرآن کے بیان کی صداقت اور معقولیت بالکل واضح ہے۔کیوں کہ یہودیوں کا حضرت مریم پر تہمت لگانا اور پھر انہیں سزا دئے بغیر چھوڑ دینا، جب کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں زنا کی سزا بڑی سخت تھی۔یہ ظاہر کرتا ہے کہ کوئی غیر معمولی واقعہ ضرور ظہور میں آیا تھا۔جس سے حضرت مریم کا پاکدامن ہونا ثابت ہو گیا تھا۔قرآن کہتا ہے یہ بچہ کی شہادت تھی جس نے ثابت کر دیا کہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ (معجزہ) ہے۔اس کے بعد کسی کو کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہی۔

۴۷۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے خیر مجسم بنایا ہے۔جہاں بھی میرا رہنا ہوگا خیر و برکت کا باعث ہوگا۔یہ نفی تھی اس بات کی کہ نہ میری ولادت باعث شر ہوئی ہے اور نہ مستقبل میں مجھ سے کسی شر کا صدور ہونے والا ہے۔یہ ان الزامات کی پیشگی تردید ہے جو یہود آگے چل کر ان پر عائد کرنے والے تھے۔

۴۸۔ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر خصوصیت سے کیا کہ یہ دین کے بنیادی ستون ہیں، جن کو ضائع کرنا دین کو ضائع کرنا ہے۔یہود نے ان کو ضائع کر دیا تھا اس لئے حضرت عیسیٰ نے زبان کھولتے ہی ان کا ذکر کیا۔

۴۹۔ نیک سلوک کرنے کے تعلق سے صرف ماں کا ذکر کیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ورنہ وہ کہتے، مجھے اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا بنایا۔قرآن کے اس بیان سے بائبل کی ان روایات کی تردید ہوتی ہے، جن سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ اپنی ماں سے بے پروا ہو گئے تھے۔(یوحنا ۲:۴)

۵۰۔ یعنی خدا کی طرف سے میرے لئے زندگی بھر سلامتی ہے اور دوسری زندگی میں بھی سلامتی ہی سلامتی۔''جس دن میں مروں گا'' کے الفاظ صراحت کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو بھی ایک نہ ایک دن مرنا ضرور ہے۔

یروشلم کے ہیکل کا نقشہ

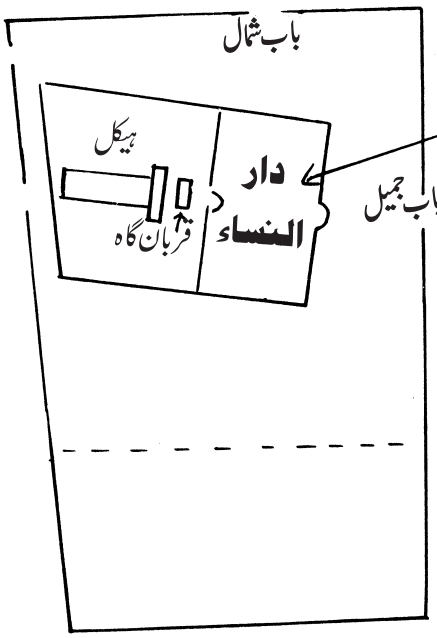

بیت لحم جہاں حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی

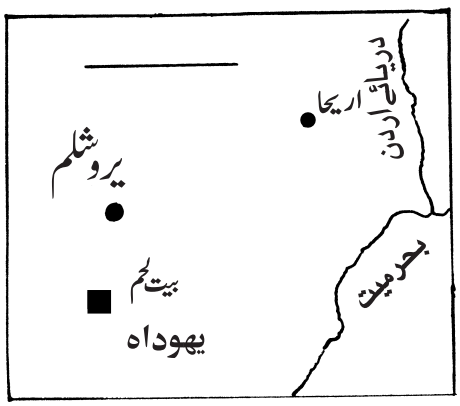

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾

۳۴ یہ ہے عیسیٰ بن مریم۔(اور یہ ہے) حق بات جس کے بارے میں لوگ جھگڑ رہے ہیں۔۵۱؎

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۳۵﴾

۳۵ اللہ کے یہ شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔۵۲؎ وہ پاک ہے۔جب وہ کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس فرماتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔۵۳؎

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۳۶﴾

۳۶ اور (عیسیٰ نے صاف صاف کہا تھا) اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔تو اسی کی عبادت کرو۔یہی سیدھی راہ ہے۔۵۴؎

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۳۷﴾

۳۷ مگر مختلف فرقوں نے باہم اختلاف کیا۔۵۵؎ تو جن لوگوں نے کفر کیا ان کیلئے ایک سخت دن کی حاضری تباہی کا سبب ہوگی۔۵۶؎

اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾

۳۸ جس دن یہ ہمارے حضور حاضر ہوں گے اس دن وہ خوب سنیں گے اور خوب دیکھیں گے،۵۷؎ مگر آج یہ ظالم کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۹﴾

۳۹ اور انہیں حسرت (پچھتاوے) کے دن سے خبردار کرو جب کہ فیصلہ چکا دیا جائے گا۵۸؎۔اور ان کا حال یہ ہے کہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔

اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۴۰﴾

۴۰ بلاشبہ ہم ہی زمین کے اور اس پر بسنے والوں کے وارث ہوں گے۔۵۹؎ اور سب ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۘ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾

۴۱ اور (اے نبی) کتاب میں ابراہیم کا ذکر کرو۶۰؎۔یقیناً وہ نہایت سچا تھا۶۱؎ اور نبی تھا۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـــًٔا ﴿۴۲﴾

۴۲ جب اس نے اپنے باپ سے کہا ابا جان! آپ کیوں ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں اور نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکتی ہیں؟ ۶۲؎

يٰٓاَبَتِ اِنِّىْ قَدْ جَاۗءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾

۴۳ ابا جان! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۶۳؎۔تو آپ میرے پیچھے چلیں میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔

۵۱۔ حضرت عیسیٰ کو یہود سرے سے نبی ہی نہیں مانتے اور نصاریٰ نے ان کی شخصیت میں غلو کر کے انہیں اللہ کا بیٹا بنا دیا۔ پھر اس بحث میں اس طرح الجھ گئے کہ اصل حقیقت دب کر رہ گئی۔ مگر قرآن نے تمام حجابات اٹھائے اور اصل حقیقت کو نمایاں کیا۔

۵۲۔ یعنی خدا کیلئے یہ نہایت فروتر بات ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ یہ عیب ہے نہ کہ خوبی۔ ایسی بات اللہ کی طرف منسوب کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ عیب اور نقص سے پاک نہیں ہے۔

۵۳۔ یعنی جس ہستی کی قدرت کی یہ شان ہو کہ کوئی بھی چیز محض اس کے کُن کہہ دینے یعنی ہو جانے کا حکم دینے سے وجود میں آتی ہو، وہ اس بات کا کہاں محتاج ہو سکتا ہے کہ کسی کو بیٹا بنالے۔

۵۴۔ حضرت عیسیٰ کا وہ بیان اوپر گذر چکا جو انہوں نے گہوارہ میں سے دیا تھا۔ یہاں ان کی اس دعوت کو پیش کیا گیا ہے جو انہوں نے نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی تھی۔ تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ آل عمران، نوٹ ۷۶۔

۵۵۔ جب اللہ کے دین میں کوئی نیا عقیدہ شامل کر لیا جاتا ہے، تو لازماً اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، جن کے نتیجہ میں فرقے وجود میں آتے ہیں۔ نصاریٰ نے جب حضرت عیسیٰ کی تعلیم سے اختلاف کیا اور ان کی شخصیت کے بارے میں غلو آمیز عقیدے گڑھ لئے تو فرقہ بندی نے جنم لیا۔ یعقوبیہ اور نسطوریہ جیسے فرقے ان میں پیدا ہو گئے اور بعد کے دور میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ۔ اس طرح وہ اپنے مرکزی نقطہ توحید سے بھی ہٹ گئے اور ان کی ملت بھی پارہ پارہ ہو گئی۔

۵۶۔ مراد قیامت کے دن کی تباہی ہے۔

۵۷۔ یعنی قیامت کے دن یہ اچھی طرح جان لیں گے کہ حقیقت کیا تھی۔ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے تھے یا بندہ؟

۵۸۔ یعنی قیامت کے دن سے خبردار کرو جو کافروں کیلئے پچھتاوے کا دن ہوگا۔ بعض مفسرین نے وہ دن مراد لیا ہے جب کہ مسلمانوں نے بیت المقدس کو فتح کیا اور نصاریٰ کیلئے حسرت کا سبب بن گیا (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۳۶) مگر آیت کے الفاظ اس تفسیر کا ساتھ نہیں دیتے۔ فیصلہ چکانے کی بات تو قرآن میں قیامت ہی کے بارے میں کہی گئی ہے۔ اور بعد کی آیت میں یہ جو فرمایا کہ ''سب ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے۔'' تو ظاہر ہے یہ قیامت کے دن ہی سے متعلق ہے۔

۵۹۔ تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ حجرات، نوٹ ۲۱۔

۶۰۔ کتاب میں ذکر کرو کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر! اللہ کی جو کتاب تم لوگوں کو سنا رہے ہو اس میں ان کو ابراہیم کا قصہ بھی سناؤ، کہ یہ قصہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اور اس کتاب (قرآن) میں شامل ہے۔

۶۱۔ ابراہیم علیہ السلام کی صفت ''صدیق'' بیان ہوئی ہے جس کے معنیٰ ہیں نہایت سچا اور راست باز۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مختلف باتوں میں آزمایا اور وہ ہر امتحان میں پورے اترے۔ بت پرستی کے خلاف انہوں نے زبردست جہاد کیا اور اس سلسلہ میں حکومت وقت کے چیلنج کو قبول کرنے میں پس وپیش نہیں کیا۔ اور اپنے والد کو بھی بُت پرستی کے بارے میں کھری کھری باتیں سنا دیں۔ شرک کے خلاف ان کی بے باکی، اللہ کی خاطر گھر بار چھوڑنا، توحید کے پرچار کیلئے سخت مشقت کے سفر کرنا اور اپنے بیٹے کو اللہ کی خاطر قربان کرنے کے لئے تیار ہو جانا ان کی صداقت شعاری کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔

قرآن کے اس بیان سے کہ ابراہیم ''صدیق'' تھے، بائبل کے اس بیان کی آپ سے آپ تردید ہوتی ہے جس میں ابراہیم کی طرف یہ جھوٹ منسوب کیا گیا ہے کہ وہ مصر گئے تو اس اندیشہ کے پیش نظر کہ وہاں کا بادشاہ ان کی بیوی (سارہ) کو ان کی خوبصورتی کی بنا پر رکھ نہ لے اور ابراہیم کو قتل نہ کر دے ابراہیم نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم یہ کہہ دینا کہ میں اس شخص کی بہن ہوں۔ (پیدائش ۱۲: ۱۱ تا ۲۰) بائبل کا یہ قصہ بالکل بے اصل ہے اگر بادشاہ کی نیت خراب تھی تو محض بہن کہہ دینے سے وہ اپنے مذموم ارادہ سے کیوں باز رہتا؟ بائبل میں مختلف مقامات پر حضرت سارہ کی جو عمریں بیان ہوئی ہیں ان کے

بقیہ صفحہ ۹۹۸ پر

يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾

۴۴ ابا جان! آپ شیطان کی پرستش نہ کیجئے ۶۴۔ شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔

يٰٓاَبَتِ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾

۴۵ ابا جان! میں ڈرتا ہوں کہ رحمٰن کا عذاب آپ کو آ نہ پکڑے اور آپ شیطان کے ساتھی بن کر رہ جائیں۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِىْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِىْ مَلِيًّا ﴿۴۶﴾

۴۶ باپ نے کہا ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے۔ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کردوں گا ۶۵۔ تو مجھ سے ہمیشہ کے لئے الگ ہوجا۔ ۶۶

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّىْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِىْ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾

۴۷ ابراہیم نے کہا سلام ہو آپ پر۔ میں آپ کے لئے اپنے رب سے معافی کی دعا کروں گا ۶۷۔ وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے۔

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّىْ ۡ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ رَبِّىْ شَقِيًّا ﴿۴۸﴾

۴۸ میں آپ لوگوں سے نیز ان سے جن کو آپ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں الگ ہوجاتا ہوں اور اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں۔ امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر محروم نہیں رہوں گا۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿۴۹﴾

۴۹ پھر جب وہ ان سے نیز ان (کے معبودوں) سے جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے الگ ہوگیا اور ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب عطا کئے۔ ۶۸ اور ان میں سے ہر ایک کو نبی بنایا۔

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾

۵۰ اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا اور ان کے لئے سچائی کی زبانیں بلند کردیں۔ ۶۹

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾

۵۱ اور کتاب میں موسیٰ کا ذکر کرو۔ وہ چنا ہوا (بندہ) تھا ۷۰۔ اور رسول اور نبی تھا۔ ۷۱

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾

۵۲ ہم نے اس کو طور کی داہنی جانب سے پکارا ۷۲۔ اور سرگوشی کے لئے قریب کیا۔ ۷۳

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾

۵۳ اور اپنی رحمت سے اس کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر اس کو عطا کیا۔ ۷۴

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ ۚ

۵۴ اور کتاب میں اسمٰعیل کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کا سچا ۷۵۔ اور رسول اور نبی تھا۔

۶۴؎ یعنی یہ بتوں کی پرستش درحقیقت شیطان کی پرستش ہے۔ کیونکہ یہ شیطان کے اشارہ پر کی جارہی ہے اور شیطان کی ایسی اطاعت کہ وہ خدا کی اطاعت کی جگہ لے لے، اس کو معبود بنانا اور شریک ٹھہرانا ہے۔

۶۵؎ اس زمانہ میں اولاد پر باپ کا زبردست دباؤ رہتا تھا اور مذہبی تعصب کی بنا پر، وہ اپنی اولاد پر ظلم کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ اور یہ مذہبی تعصب ہی تھا جس کی بنا پر حضرت ابراہیم کے والد نے انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دی۔

۶۶؎ یعنی تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم گھر چھوڑ کر چلے جاؤ اور مجھے صورت نہ دکھاؤ۔

۶۷؎ یہ تھی ابراہیم کے کردار کی بلندی کہ باپ انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ اور گھر سے نکل جانے کا حکم دیتا ہے۔ لیکن ان کی پیشانی پر شکن نہیں آتی بلکہ وہ سلامتی کی دعا دیتے ہوئے اور اپنے رب سے ان کے لئے مغفرت کی درخواست کا وعدہ کرتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے وعدہ کو نبھایا۔ لیکن جب ان پر یہ بات واضح ہوئی کہ ان کا باپ شرک سے باز آنے والا نہیں اور خدا کا دشمن ہے تو وہ دعا سے رک گئے۔ جیسا کہ سورۂ توبہ آیت ۱۱۴؎ میں بیان ہوا ہے۔ مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ توبہ، نوٹ ۲۰۹؎ اور ۲۱۰؎۔

۶۸؎ یعنی جب ابراہیم اپنے وطن کو چھوڑ کر شام اور فلسطین پہنچے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی اولاد عطا فرمائی کہ ان کی نسل میں بڑی برکت ہوئی۔ اور فیض کے چشمے جاری ہو گئے۔

یعقوب ابراہیم کے پوتے ہیں جن کا دوسرا نام اسرائیل ہے۔ ان ہی سے بنی اسرائیل کا سلسلہ چلا۔

۶۹؎ یعنی سچے لوگوں کی زبان پر ان کی تعریف وتوصیف کے کلمات جاری کر دئے۔ اہل ایمان کے دلوں میں ان کی سچی قدر ہے، وہ احترام سے ان کا نام لیتے ہیں اور ان پر سلام اور درود بھیجتے ہیں۔

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ دنیا میں سچی عزت اور خدا کے نیک بندوں میں مقبولیت اور ان کی زبانوں پر ذکر جمیل اللہ کا بہت بڑا انعام ہے جو کسی بندہ کو حاصل ہو۔ لوگ جھوٹی شہرت اور ناموری کے پیچھے دوڑتے ہیں مگر اللہ کے نیک بندے اس سے بالکل بے نیاز ہوتے ہیں۔

۷۰؎ یعنی اللہ نے اپنے تقرب کے لئے موسیٰ کو چن لیا تھا۔

۷۱؎ رسول کے معنیٰ ہیں بھیجا ہوا پیغامبر، اور نبی کے معنیٰ ہیں خبر دینے والا۔ یعنی جو اللہ کی طرف سے لوگوں کو خبریں سنائے۔ قرآن میں یہ دونوں لفظ اللہ کے ان مخصوص بندوں کیلئے، جن پر اسکی طرف سے وحی نازل کی جاتی ہے اصطلاح کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ البتہ رسول کا لفظ فرستادہ (بھیجے ہوئے) کے معنیٰ میں کہیں کہیں مخصوص فرشتوں کیلئے بھی استعمال ہوا ہے۔

رسول اور نبی کا مفہوم ایک ہی ہے لیکن دونوں اصطلاحات ایک ساتھ استعمال کرنے سے مقصود ان کی امت کے تعلق سے ان کی پیغمبرانہ حیثیت کو واضح کرنا ہے، چنانچہ آیت ۴۱ تا ۵۷ میں متعدد انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن حضرت موسیٰ اور حضرت اسمٰعیل کا ذکر اس انداز سے ہوا ہے کہ وہ رسول اور نبی تھے۔ چونکہ حضرت ابراہیم کی نسل کی دو شاخیں ہوئیں ایک بنی اسرائیل اور دوسری بنی اسمٰعیل۔ اور بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کی امت قرار پائے اور بنی اسمٰعیل حضرت اسمٰعیل کی۔ اس لئے ان کی رسالت کی حیثیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت اسمٰعیل اس شان کے نبی تھے کہ آج جو دو بڑی امتیں تم دیکھ رہے ہو وہ ان ہی سے وابستہ ہیں۔

۷۲؎ ایمن (داہنا) کا لفظ عربی میں مبارک کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں طور کی داہنی جانب سے مراد طور کی وہ مبارک سرزمین ہے، جہاں حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے پکارا تھا اور انہیں نبوت عطا کی تھی۔ قرآن میں دوسری جگہ اس سرزمین کو طویٰ کی مقدس وادی فرمایا گیا ہے۔

بقیہ صفحہ ۹۹۹ پر

وَ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾

۵۵ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا ۷۶۔ اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾

۵۶ اور کتاب میں ادریس کا ذکر کرو ۷۷۔ وہ نہایت سچا تھا اور نبی تھا۔

وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾

۵۷ اور ہم نے اسے بلند مقام پر اٹھایا تھا۔ ۷۸۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۖ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۖ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ؕ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴿۵۸﴾

۵۸ یہ ہیں انبیاء میں سے وہ لوگ جن پر اللہ نے انعام فرمایا۔ ۷۹۔ آدم کی اولاد میں سے ۸۰۔ اور ان لوگوں کی نسل سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کرایا۔ اور ابراہیم کی نسل سے اور اسرائیل کی نسل سے ۸۱۔ اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور منتخب کیا۔ ان کو جب رحمٰن کی آیتیں سنائی جاتیں تو وہ روتے ہوئے سجدہ میں گر جاتے۔ ۸۲۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾

۵۹ پھر ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشات کے پیچھے پڑ گئے ۸۳۔ تو قریب ہے کہ یہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں۔ ۸۴۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ﴿۶۰﴾

۶۰ البتہ جو لوگ توبہ کر لیں، ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہ ہوگی۔ ۸۵۔

جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿۶۱﴾

۶۱ ہمیشگی کے باغ جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے غائبانہ وعدہ کر رکھا ہے۔ یقیناً اس کا وعدہ پورا ہو کر رہنا ہے۔ ۸۶۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾

۶۲ وہاں وہ کوئی لغو بات نہیں سنیں گے ۸۷۔ جو کچھ سنیں گے سلامتی ہی کی بات ہوگی۔ اور انہیں صبح و شام اپنا رزق ملتا رہے گا۔ ۸۸۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾

۶۳ یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے ان کو بنائیں گے جو اللہ سے ڈرتے رہے۔ ۸۹۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿۶۴﴾

۶۴ (اے پیغمبر!) ہم آپ کے رب کے حکم کے بغیر نہیں اترتے ۹۰۔ جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو پیچھے ہے اور جو اس کے درمیان ہے سب اسی کا ہے۔ اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں۔ ۹۱۔

۷۶۔ حضرت اسمٰعیل کا یہ وصف کہ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتے تھے، خصوصیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ عرب جو اُن کی نسل سے ہیں غور کریں کہ ان کے کرنے کا کام کیا تھا اور وہ کر کیا رہے ہیں۔ نیز اہل ایمان کے لئے بھی یہ اسوہ ہو کہ وہ اپنے گھر والوں کی اصلاح کی فکر کریں اور خاص طور سے نماز کا اہتمام کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کریں۔

۷۷۔ حضرت ادریس کا ذکر قرآن میں مختصراً ہوا ہے۔ ایک یہاں اور دوسرے سورۂ انبیاء آیت ۸۵ میں۔ ان کے حالات کسی صحیح حدیث میں بیان نہیں ہوئے ہیں بجز معراج والی حدیث کے، جس میں ان کے چوتھے آسمان پر ہونے کا ذکر ہے۔ بائبل میں اس نام کی کسی شخصیت کا ذکر نہیں ہے۔ مفسرین نے ان کے بارے میں جو روایتیں بیان کی ہیں وہ اسرائیلیات میں سے ہیں۔ اس لئے ہمیں قرآن کے بیان ہی پر اکتفاء کرنا چاہئے۔

حضرت ادریس کی شخصیت جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے صدق و وفا کے لحاظ سے عظیم شخصیت تھی۔ تاریخ نے انہیں بھلا دیا تھا لیکن قرآن نے ان کے ذِکر کو دوام بخشا۔

۷۸۔ یعنی ان کا مرتبہ بلند کر دیا تھا۔

۷۹۔ اوپر کی آیات سے واضح ہے کہ ان انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے کس طرح کے انعام (فضل) سے نوازا تھا۔ یہی وہ انعام ہے جس کا ذکر سورۂ فاتحہ میں اس طرح ہوا ہوا ہے **الذین انعمت علیھم** (جن پر تیرا انعام ہوا)۔

۸۰۔ یعنی یہ سب انبیاء آدم کی اولاد میں سے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی نہ خدا تھا، نہ خدا کا بیٹا اور نہ خدا کا اوتار۔

۸۱۔ حضرت موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام، اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔

۸۲۔ یہاں انبیاء علیہم السلام کا یہ اسوہ بیان ہوا ہے کہ جب آیاتِ الٰہی انہیں سنائی جاتیں، تو ان پر رقت طاری ہوتی اور وہ بے اختیار سجدے میں گر جاتے۔

کلام الٰہی کی تاثیر سوز و گداز اور خشوع و خضوع ہے، مگر موجودہ زمانہ کے قاری عام طور سے خوش الحانی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کی قرأت سوز و گداز سے خالی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ سننے والے کلام الٰہی کا اثر قبول کرنے کے بجائے قاری کی خوش الحانی کی داد دینے لگتے ہیں۔

یہ آیت سجدہ ہے اس لئے اس کی تلاوت کرنے یا سننے پر سجدہ کرنا چاہئے۔

۸۳۔ اشارہ ہے یہود و نصاریٰ کی طرف جنہوں نے انبیاء کے اسوہ کو چھوڑا اور ان کے صرف عقیدت مند ہو کر رہ گئے۔ نماز کے اہتمام کی جو تاکید انہوں نے کی تھی اس کو انہوں نے بھلا دیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ خواہشات کے غلام بن کر رہ گئے۔

بنی اسمٰعیل (عربوں) کا حال بھی یہی تھا۔ حضرت اسمٰعیل نے اپنی اولاد کو نماز قائم کرنے کا تاکیدی حکم دیا تھا، مگر ان کی نسل نے نماز کی جگہ بُت پرستی اختیار کی۔

نماز کو ضائع کرنے اور خواہشات کے پیچھے چلنے کا جو ایک ساتھ ذکر ہوا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ نماز کو ترک کرنے کے بعد شریعت کی پابندی کرنا اور نیک عملی کی زندگی گذارنا ممکن ہی نہیں رہتا۔ ایسا شخص لازماً اپنے نفس کی خواہشات کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی زندگی غلط رخ اختیار کر جاتی ہے۔

اس آیت میں مسلمانوں کے لئے بہت بڑا سبق ہے۔ سابقہ امتوں کے نماز کو ضائع کرنے کے عبرتناک انجام کے سامنے آجانے کے بعد ان کو سختی کے ساتھ نماز کے حکم پر کاربند ہونا چاہئے تھا۔ مگر افسوس کہ آج مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نماز کو ترک کئے ہوئے ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی اخلاقی اور عملی حالت گر گئی ہے اور ان کی زندگیاں خواہشات کے تابع ہو کر رہ گئی ہیں۔

۸۴۔ معلوم ہوا کہ نماز ترک کرنا گمراہی ہے۔

۸۵؎ یعنی جنہوں نے نماز کو ضائع کر کے خواہشات کی پیروی کی ان کیلئے اصلاح کا موقع ہے۔ اگر وہ اپنی غلط روی سے باز آجائیں اور اپنے گناہوں کی اللہ سے معافی مانگیں۔ نیز قرآن اور اس کے پیغمبر پر ایمان لائیں اور نیک عمل کریں تو وہ جنت کے مستحق ہوں گے اور ان کی کوئی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

۸۶؎ یعنی اگرچہ جنت کے باغ ان بندوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں مگر ان کا ان میں داخل ہونا یقینی ہے۔ کیوں کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے جسے لازماً پورا ہونا ہے۔

۸۷؎ تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ غاشیہ، نوٹ۔ ۱۳؎

۸۸؎ یعنی جنت میں رزق کے لئے کوئی جدوجہد کرنا نہیں پڑے گی بلکہ دائمی طور پر انہیں رزق مہیا ہوتا رہے گا۔

۸۹؎ یعنی جنت کے مالک وہ لوگ بنیں گے جنہوں نے اللہ سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کی تھی۔ اوپر کے سلسلۂ بیان سے تقویٰ کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ جو شخص ان اوصاف حمیدہ کو اپنے اندر پیدا کرتا ہے وہی درحقیقت متقی ہے۔

۹۰؎ یہ جملہ معترضہ ہے جو وحی لانے والے فرشتوں کی زبان سے ادا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے۔

وحی کا سلسلہ جب کچھ دنوں کے لئے رک جاتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم بے چینی محسوس کرنے لگتے۔ کیوں کہ جن صبر آزما حالات سے آپ گذر رہے تھے ان میں وحی کا نزول آپ کے لئے باعث تسلی ہوتا، نیز مزید رہنمائی کے لئے بھی آپ ﷺ وحی الٰہی کے شدت سے منتظر رہتے۔ آپ کے اسی انتظار کے پیش نظر جبریل اور ان کے ساتھی فرشتوں نے اپنی یہ حیثیت واضح کر دی کہ ہمارے اختیار میں یہ بات نہیں ہے کہ جب چاہیں نازل ہوں، بلکہ جب اللہ ہمیں حکم دیتا ہے ہم اس کے حکم کی تعمیل میں اترتے ہیں۔

اگرچہ یہ جملہ معترضہ ہے لیکن اوپر کے سلسلۂ بیان سے بھی اس کا ربط ہے۔ اوپر انبیاء علیہم السلام کی حیثیت واضح کی گئی ہے، یہاں فرشتوں کی حیثیت واضح کی گئی ہے کہ سب اس کے مطیع فرمان ہیں۔

۹۱؎ یعنی اللہ سارے زمان و مکان کا مالک ہے مستقبل ماضی اور حال سب سے وہ اچھی طرح باخبر ہے، اس سے کسی بھول کا امکان نہیں۔ لہٰذا اے پیغمبر! جو حالات تمہیں پیش آرہے ہیں وہ اس سے مخفی نہیں اور اس کی حکمت جب متقاضی ہوتی ہے وہ وحی نازل کرتا ہے جسے لے کر ہم (یعنی فرشتے) اترتے ہیں۔

یہاں فرشتوں کا بیان ختم ہوا۔

❑❑❑❑❑❑

بقیہ صفحہ ۹۹۳ سے آگے

پیش نظر مصر کے سفر کے موقع پر حضرت سارہ کوئی کمسن خاتون نہیں تھیں کہ انہیں بادشاہ سے خطرہ لاحق ہوتا۔ پھر بائبل میں اسی قسم کا جھوٹ حضرت اسحٰق کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے۔ یعنی انہوں نے بھی اس قسم کے اندیشہ کے پیش نظر اپنی بیوی کے بارے میں کہا کہ وہ میری بہن ہے۔ (پیدائش باب ۲۶)

بائبل کی یہ باتیں اتنی الجھی ہوئی اور غیر معقول ہیں کہ ان پر ہرگز یقیں نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ بائبل کے مرتبین نے اپنے انبیاء کی سیرت کو داغدار بنایا ہے لیکن قرآن ان کی سیرت کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ بالکل بے داغ نظر آتی ہیں اور یہ اس کی صداقت کی دلیل ہے۔

۶۲؎ تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ انعام، نوٹ ۱۲۷؎، ۱۲۸؎ اور ۱۲۹؎۔

۶۳؎ علم سے مراد علم وحی اور علم نبوت ہے۔

بقیہ صفحہ ۹۹۵ سے آگے

اِذۡ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًى

''جب کہ اس کے رب نے اسے طویٰ کی مقدس وادی میں پکارا۔''

داہنی جانب کے اگر لفظی معنیٰ مراد لئے جائیں تو مطلب ہوگا، کہ حضرت موسیٰ جب مدین سے مصر کی طرف چلے ہیں تو طور کے اس حصہ سے، جو ان کی داہنی جانب تھا اللہ تعالیٰ نے انہیں آواز دی۔

۷۳؎ یعنی موسیٰ سے تنہائی میں اللہ تعالیٰ نے باتیں کیں۔ اور دو بدو باتیں کرنے کا اعزاز بخشنے کے لئے انہیں اپنے سے قریب کیا۔

۷۴؎ یعنی ہارون کو نبی بنا کر موسیٰ کا معاون بنایا۔

۷۵؎ اشارہ ہے قربانی کے واقعہ کی طرف کہ انہوں نے اپنے والد سے یہ جو کہا تھا کہ:

سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ

''آپ مجھے انشاء اللہ صابر پائیں گے۔'' (**صافات۔۱۰۲**)

تو یہ وعدہ انہوں نے پورا کیا اور خدا کی خاطر قربان ہونے کے لئے پیشانی کے بل لیٹ گئے۔ وعدہ وفائی کی اس سے زیادہ اونچی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۶۵﴾

۶۵ وہ رب ہے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کا۔ تو اسی کی عبادت کر و اور اسی کی عبادت پر قائم رہو۔ کیا تمہارے علم میں اس کا ہم نام (اس جیسا) کوئی ہے؟ ۹۲؎

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾

۶۶ اور انسان کہتا ہے کیا جب میں مر جاؤں گا تو پھر زندہ کر کے نکالا جاؤں گا۔

اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ﴿۶۷﴾

۶۷ کیا انسان کو یاد نہیں کہ ہم اس سے پہلے اسے پیدا کر چکے ہیں جب کہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۸﴾

۶۸ تمہارے رب کی قسم، ہم ان سب کو نیز شیطانوں کو ضرور اکٹھا کریں گے۔ پھر ان سب کو جہنم کے گرد اس طرح حاضر کریں گے کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے۔ ۹۳؎

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿۶۹﴾

۶۹ پھر ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو الگ کریں گے جو رحمٰن کے خلاف بہت زیادہ سرکش بنے ہوئے تھے۔ ۹۴؎

ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿۷۰﴾

۷۰ پھر ہم ان لوگوں کو بخوبی جانتے ہیں جو جہنم میں جانے کے زیادہ سزاوار ہیں۔

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿۷۱﴾

۷۱ اور تم میں سے کوئی نہیں جو اس پر وارد نہ ہو۔ یہ طے شدہ بات ہے جو تمہارے رب پر لازم ہے۔ ۹۵؎

ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿۷۲﴾

۷۲ پھر، ۹۶؎ ہم ان لوگوں کو بچا لیں گے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا تھا ۹۷؎ اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔ ۹۸؎

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾

۷۳ اور جب ہماری روشن آیتیں ان لوگوں کو سنائی جاتی ہیں تو کفر کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ ہم دونوں فریقوں میں سے کون ہے جو بہتر مقام رکھتا ہے اور بہتر مجلس؟

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿۷۴﴾

۷۴ حالانکہ ہم اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو کہیں زیادہ ساز و سامان رکھتی تھیں اور شان و شوکت میں کہیں بڑھ کر تھیں۔ ۹۹؎

۹۲۔ یعنی اللہ کی کوئی نظیر نہیں۔ وہ اپنی ذات میں بھی یکتا ہے اور صفات میں بھی، نیز اس کا نام ''اللہ'' اس کے لئے خاص ہے۔ کوئی اس کا ہم نام نہیں۔ پھر عبادت کا مستحق اس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟

۹۳۔ یعنی نہایت ذلت کی حالت میں۔

۹۴۔ یہ ان کے پیشوا، سردار اور لیڈر رہوں گے جو دنیا میں بہت سرکش بنے ہوئے تھے، اور اپنی قوم کو گمراہ کرتے رہے۔

۹۵۔ اوپر کی آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہوا ہے جو انسان کے دوبارہ پیدا کئے جانے کے منکر تھے۔ ان کے بارے میں آیت ۶۸ میں فرمایا گیا ہے کہ ان سب کو ہم جہنم کے گرد اس حال میں جمع کریں گے کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے۔ یہاں ان منکرین سے براہ راست خطاب کر کے فرمایا ہے کہ یاد رکھو تم میں سے کوئی بھی چھوٹنے والا نہیں، ہر کافر کو جہنم پر لازماً پہنچنا ہوگا۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے رب کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ کافر جہنم کی سزا بھگتیں، لہٰذا یہ فیصلہ قیامت کے دن نافذ ہو کر رہے گا۔ یہاں چند باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے تا کہ اس آیت کا صحیح مفہوم واضح ہو۔

۱۔ آیت کے پہلے فقرہ ''تم میں سے کوئی نہیں جو اس پر وارد نہ ہو'' میں خطاب کافروں سے ہے اور دوسرے فقرہ ''یہ ایک طے شدہ بات ہے جو تمہارے رب پر لازم ہے۔'' میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے۔ ایک ہی آیت میں خطاب کی یہ تبدیلی بلاغت کے تقاضوں کے تحت ہے۔ قرآن میں یہی اسلوب دوسری جگہ بھی اختیار کیا گیا ہے چنانچہ سورۂ انعام آیت ۱۲۸ میں ہے: **قَالَ النَّارُ مَثْوٰكُمْ خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۔ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ**۔ ''ارشاد ہوگا تمہارا ٹھکانا آگ ہے جس میں تم ہمیشہ رہو گے۔ مگر جو اللہ چاہے (اے پیغمبر) بے شک تمہارا رب حکمت والا اور علم والا ہے۔''

اس آیت میں بھی پہلے فقرہ میں خطاب منکرین سے ہے اور دوسرا فقرہ **اِنَّ رَبَّكَ**۔۔۔ ''تمہارا رب''۔۔۔۔۔ میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے۔

۲۔ متن میں لفظ ''وارد'' استعمال ہوا ہے جو ''ورود'' سے ہے۔ عربی میں یہ لفظ پہنچنے کے معنیٰ میں بھی آتا ہے اور داخل ہونے کے معنیٰ میں بھی۔ صحاح جوہری میں ہے: **وردفلان ورود اًحضر** ''فلاں وارد ہوا یعنی حاضر ہوا۔'' (الصحاح للجوہری ج ۲ ص ۵۴۹)

لسان العرب میں ہے: **ورود علیه: اشرف علیه، دخله اولم یدخله** (لسان العرب ج ۳ ص ۴۵۷) ''اس پر وارد ہوا یعنی اس پر پہنچ گیا خواہ وہ اس میں داخل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔''

اور قرآن میں بھی یہ لفظ ان دونوں معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ پہلے معنیٰ کی مثال سورۂ قصص کی آیت ۲۳ ہے: **وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ** ''جب وہ مدین کے پانی پر وارد (پہنچا) ہوا۔''

ظاہر ہے یہاں وَرَدَ کے معنیٰ پانی پر پہنچنے کے ہیں نہ کہ پانی میں داخل ہونے کے۔ اور دوسرے معنیٰ کی مثال سورۂ انبیاء کی آیت ۹۹ ہے: **لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا**۔ ''اگر یہ (بت) خدا ہوتے تو جہنم میں وارد (داخل) نہ ہوتے۔''

اس آیت میں وَرَدَ کا لفظ جہنم میں داخل ہونے کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ اس بنا پر مفسرین کے ایک گروہ نے آیت کی تاویل یہ کی ہے کہ اس میں خطاب عام انسانوں سے ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ہر شخص کہ خواہ وہ کافر ہو یا مؤمن متقی، جہنم پر حاضر ہونا ضرور ہوگا۔ کافروں کی حاضری تو اس میں داخل ہونے کے لئے ہوگی لیکن متقیوں کی حاضری محض گزرنے کے طور پر ہوگی اور اللہ تعالیٰ انہیں اس سے نجات دے گا۔ مگر یہ تاویل قرآن کی دوسری آیتوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ فرمایا گیا ہے: **اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۔ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خَالِدُوْنَ**۔ (سورۂ انبیاء: ۱۰۲) ''جن کیلئے ہماری طرف سے پہلے ہی بھلائی کا فیصلہ ہو چکا ہے وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔ وہ اس کی بھنک بھی نہیں سنیں گے اور اپنی دل پسند چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے۔''

انہیں قیامت کے دن کوئی پریشانی لاحق نہ ہوگی:

لَا یَحۡزُنُهُمُ الۡفَزَعُ الۡاَکۡبَرُ وَ تَتَلَقّٰىهُمُ الۡمَلٰٓئِکَةُ ؕ هٰذَا یَوۡمُکُمُ الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ۔ (انبیاء:۱۰۳)

''(اس روز کی) بڑی گھبراہٹ انہیں پریشان نہیں کرے گی اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے کہ یہ ہے وہ دن جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا تھا۔''

اور اسی سورہ کی آیت ۸۵ میں فرمایا گیا ہے: یَوۡمَ نَحۡشُرُ الۡمُتَّقِیۡنَ اِلَی الرَّحۡمٰنِ وَفۡدًا۔ (مریم: ۸۵) ''جس دن ہم متقیوں کو رحمٰن کے حضور مہمانوں کی طرح جمع کریں گے۔''

۳۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ بات ارشاد ہوئی ہے کہ شیطان کی پیروی کرنے والے انسانوں اور جنوں سے جہنم کو بھر دوں گا۔ اس لئے یہاں جو فرمایا گیا کہ ''یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ جس کو پورا کرنا تمہارے رب پر لازم ہے۔'' تو اس سے مراد وہی فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کافروں سے جہنم کو بھر دینے کے سلسلے میں کیا ہے۔

۹۶۔ ثُمَّ (پھر) عربی میں ''بعد'' (تراخی) کے معنیٰ ہی میں نہیں آتا بلکہ ''اور'' (ترتیبِ اخباری) کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔ (ملاحظہ ہو الانحو الوافی ج ۳ ص ۵۷۸) مثال کے طور پر اوپر آیت ۷۰ میں فرمایا گیا ہے: ثُمَّ لَنَحۡنُ اَعۡلَمُ بِالَّذِیۡنَ هُمۡ اَوۡلٰی بِهَا صِلِیًّا۔ ''پھر ہم ان لوگوں کو بخوبی جانتے ہیں جو جہنم میں جانے کے زیادہ سزاوار ہیں۔''

ظاہر ہے اس آیت میں ثم (پھر) کا مطلب ہے ''اور'' یا ''یہ بھی'' اسی طرح زیر تفسیر آیت میں ثم ترتیب زمانی کو نہیں بلکہ ترتیبِ اخباری کو ظاہر کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں ہم کافروں کو جہنم پر وارد کریں گے وہاں متقیوں کو بچا لیں گے۔

۹۷۔ نُنَجِّی ''نجات دیں گے'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ متقیوں کو پہلے تو جہنم پر وارد کریں گے، اور پھر اس مصیبت سے انہیں نجات دیں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انہیں اس طرح بچا لیں گے کہ جہنم کے عذاب اور اس کی تکلیف سے وہ بالکل محفوظ رہیں گے۔ نجات کا یہ مفہوم سورۂ ہود کی آیت ۵۸ سے بھی واضح ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔''

وَ نَجَّیۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ غَلِیۡظٍ

''ہم نے ان کو سخت عذاب سے نجات دی۔''

ظاہر ہے یہاں نجات دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو عذاب قومِ ہود پر آیا تھا اس میں اہل ایمان بھی گھر گئے تھے اور پھر اس سے انہیں نجات دی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس عذاب کے آنے سے پہلے ہی اہل ایمان کو وہاں سے محفوظ مقام پر منتقل کرا دیا گیا اور عذاب سے بچا لیا گیا۔

۹۸۔ یعنی ظالموں (مشرکوں اور کافروں) کے لئے نجات کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ انہیں جس طرح گھٹنوں کے بل ذلت کی حالت میں جہنم میں جھونک دیا گیا تھا اسی حالت میں انہیں دائمی عذاب بھگتنے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا۔

۹۹۔ غریب مسلمانوں کے مقابلہ میں منکرین حق کو جو دنیوی شان وشوکت حاصل تھی، اور ان کی مجلسوں میں جو جمگھٹ ہوتا تھا اس پر ان کو نہ صرف فخر تھا بلکہ وہ اس زعم میں مبتلا تھے، کہ وہ اللہ کی نظر میں پسندیدہ ہیں ورنہ انہیں یہ شان وشوکت حاصل نہ ہوتی۔

ان کے اس خیال کو غلط قرار دیتے ہوئے یہاں فرمایا ہے کہ اس سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں، جو ان سے کہیں زیادہ ساز وسامان اور شان و شوکت رکھتی تھیں۔ ان کی تباہی اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی قوم کو دنیوی شان وشوکت کا حاصل ہو جانا، اس کے خدا کی نظر میں پسندیدہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اگر وہ کفر کی راہ اختیار کرتی ہے تو وہ اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکتی۔

جس چیز کا وہ دعویٰ کرتا ہے اس کے وارث ہم ہوں گے۔ اور وہ ہمارے سامنے تنہا حاضر ہوگا۔ ان لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں تا کہ وہ ان کے مددگار ہوں۔ ہرگز نہیں۔ وہ قیامت کے دن ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے مخالف بن جائیں گے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ ہم نے کافروں پر شیطانوں کو چھوڑ رکھا ہے جو انہیں اکساتے رہتے ہیں۔ (القرآن)

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى
إِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ ۭ فَسَيَعْلَمُوْنَ
مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿۷۵﴾

۷۵ جو لوگ گمراہی میں پڑتے ہیں رحمٰن انہیں ڈھیل دیا کرتا ہے ۱۰۰۔ یہاں تک کہ جب وہ اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے خواہ وہ عذاب ہو ۱۰۱، یا قیامت کی گھڑی۔ اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ کس کی جگہ بدتر اور کس کا جتھا نہایت کمزور ہے۔

وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ۭ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ
خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾

۷۶ اور جو لوگ ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں اللہ ان کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے ۱۰۲۔ اور باقی رہنے والی نیکیاں تمہارے رب کے نزدیک اجر کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں اور انجام کے اعتبار سے بھی۔ ۱۰۳۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ
مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾

۷۷ تم نے دیکھا اس شخص کو جس نے ہماری آیتوں کا انکار کیا اور کہتا ہے کہ میں ضرور مال اور اولاد سے نوازا جاؤں گا۔ ۱۰۴۔

اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾

۷۸ کیا اس نے غیب میں جھانک کر دیکھا ہے یا رحمٰن سے کوئی عہد لے رکھا ہے۔ ۱۰۵۔

كَلَّا ۭ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾

۷۹ ہرگز نہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے ہم اسے لکھ لیں گے اور اس کے عذاب میں مزید اضافہ کریں گے۔

وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾

۸۰ جس چیز کا وہ دعویٰ کرتا ہے اس کے وارث ہم ہوں گے۔ اور وہ ہمارے سامنے تنہا حاضر ہوگا۔ ۱۰۶۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾

۸۱ ان لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے مددگار ہوں۔

كَلَّا ۭ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾

۸۲ ہرگز نہیں۔ وہ قیامت کے دن ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے مخالف بن جائیں گے۔ ۱۰۷۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾

۸۳ کیا تم دیکھتے نہیں کہ ہم نے کافروں پر شیطانوں کو چھوڑ رکھا ہے جو انہیں اُکساتے رہتے ہیں۔ ۱۰۸۔

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾

۸۴ تو ان کے خلاف (فیصلہ کے لئے) تم جلدی نہ کرو۔ ہم ان کے دن گن رہے ہیں۔ ۱۰۹۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾

۸۵ جس دن ہم متقیوں کو رحمٰن کے حضور شاہی مہمانوں کی طرح جمع کریں گے۔ ۱۱۰۔

۱۰۰؎ یعنی خدا کی رحمت کا تقاضا ہے کہ بگڑے ہوئے لوگوں کو سنبھلنے کا موقع دے۔اس لئے وہ گمراہی میں مبتلا ہونے والوں کو فوراً نہیں پکڑتا بلکہ، ڈھیل دے دیتا ہے۔

۱۰۱؎ مراد دنیا کا عذاب ہے۔

۱۰۲؎ یعنی راہ ہدایت اختیار کرنے والوں پر مزید ہدایت کے دروازے کھلتے ہیں۔انہیں نیک کاموں کی مزید توفیق ملتی ہے،اور وہ راہ ہدایت پر آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

۱۰۳؎ تشریح کیلئے ملاحظہ ہو سورۂ کہف نوٹ ۶۵؎۔

۱۰۴؎ مراد کوئی متعین شخص نہیں، بلکہ ہر وہ شخص ہے جو آخرت کا منکر ہو اور ساتھ ہی اس بات کا دعویٰ کرتا ہو کہ اگر آخرت برپا ہوئی،تو وہاں بھی اس کو اسی طرح مال اور اولاد کی نعمتیں ملیں گی جس طرح دنیا میں ملی ہیں۔دنیا کے پرستار ہمیشہ شاندار مستقبل کے خواب ہی دیکھا کرتے ہیں۔

۱۰۵؎ یعنی اس کا یہ خیال اور یہ دعویٰ کس بنیاد پر ہے؟ آیا اس نے غیب میں جھانک کر دیکھ لیا ہے کہ آخرت میں اس کے لئے خیریت ہی خیریت ہے۔یا خدا سے اس بات کا عہد لے رکھا ہے کہ وہ اسے ہمیشہ مال و اولاد سے نوازتا رہے گا؟ اگر دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں ہے تو پھر روشن مستقبل کی کیا ضمانت؟

۱۰۶؎ یعنی مال و اولاد کی جو نعمتیں اسے اس عارضی زندگی میں دی گئی ہیں،اور جن کے بارے میں وہ دعوے کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ چیزیں آئندہ بھی اسے ملیں گی،وہ بالآخر اللہ ہی کی مِلک ہونے والی ہیں۔اور قیامت کے دن اسے تنہا خدا کے حضور حاضر ہونا ہوگا۔

۱۰۷؎ یعنی ان لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود اس لئے بنا رکھے ہیں،تاکہ وہ ان کی عبادت سے خوش ہو کر ان کی مدد کریں،بلاؤں کو ٹال دیں اور ہر قسم کی آفتوں سے انہیں نجات دلائیں۔مگر یہ سب ان کے غلط خیالات اور باطل عقائد ہیں۔وہ آج اپنے ان عقائد کے خلاف کچھ سننے کے لئے تیار نہیں ہیں، لیکن قیامت کے دن وہ دیکھ لیں گے کہ ان کے معبود ان کے مخالف بن گئے ہیں،وہ کہیں گے ہمیں نہیں معلوم کہ تم ہماری عبادت کرتے تھے،اور ہم نے تم سے کب کہا تھا کہ ہماری عبادت کرو۔اس طرح میدان حشر میں وہ ان کی مدد کرنے سے رہے،الٹے ان کے مخالف بن جائیں گے۔

۱۰۸؎ جو لوگ کفر کرتے ہیں ان پر شیطانوں کو مسلط کر دیا جاتا ہے،جو انہیں اہل ایمان کے خلاف خوب اکساتے ہیں۔اس طرح یہ کافر دعوت حق کے مخالف،اہل ایمان کے دشمن بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔اور پھر یہ زمین حق و باطل کی رزم گاہ بن جاتی ہے۔

۱۰۹؎ یعنی تم صبر کے ساتھ ہمارے فیصلہ کا انتظار کرو۔ان کے لئے جو مہلت ہم نے مقرر کی ہے وہ بہر حال پوری ہونا ہے۔ہم اس کا ایک ایک لمحہ گن رہے ہیں۔عذاب ان پر نہ ایک لمحہ پہلے آسکتا ہے اور نہ ایک لمحہ بعد۔

۱۱۰؎ ''رحمٰن کے حضور'' کہنے میں اللہ کی شان رحمت کا اظہار ہے۔مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن ہم متقیوں کو اپنے حضور اس اعزاز و اکرام کے ساتھ جمع کریں گے کہ یہ نہایت معزز وفد ہے،جو فرمانروائے کائنات سے ملنے کے لئے آیا ہے۔اور پھر ہم انہیں اپنی رحمت اور نوازشوں سے مالا مال کر دیں گے۔

وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾

۸۶ اور مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح ہانک لے جائیں گے۔

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾

۸۷ (اس دن) کسی کو شفاعت کا اختیار نہ ہوگا۔ وہی شفاعت کر سکے گا جس نے رحمٰن سے فرمان حاصل کر لیا ہو۔ ۱۱۱

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾

۸۸ یہ کہتے ہیں رحمٰن نے بیٹا بنا رکھا ہے۔ ۱۱۲

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾

۸۹ بڑی سخت بات ہے جو تم نے گڑھ لی۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾

۹۰ قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑے، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر پڑیں۔

اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾

۹۱ اس بات پر کہ یہ رحمٰن کے لئے بیٹا ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ ۱۱۳

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾

۹۲ رحمٰن کی یہ شان نہیں کہ (کسی کو) بیٹا بنائے۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾

۹۳ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب اس کے حضور بندہ کی حیثیت سے حاضر ہونے والے ہیں۔ ۱۱۴

لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾

۹۴ سب کا اس نے احاطہ کر رکھا ہے اور ایک ایک کو گن رکھا ہے۔ ۱۱۵

وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾

۹۵ اور سب قیامت کے دن اکیلے اکیلے حاضر ہوں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

۹۶ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے رحمٰن ان کے لئے محبت پیدا کر دے گا۔ ۱۱۶

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾

۹۷ ہم نے اس (کتاب) کو تمہاری زبان میں اس لئے آسان بنایا ہے تاکہ تم متقیوں کو خوشخبری دے دو اور جھگڑالو لوگوں کو خبردار کرو۔ ۱۱۷

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

۹۸ ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ کیا تم ان میں سے کسی کو موجود پاتے ہو یا تمہیں ان کی بھنک بھی سنائی دیتی ہے ؟ ۱۱۸

۱۱۱؎ یعنی جن کو انہوں نے معبود بنا رکھا ہے، وہ قیامت کے دن خدا کے حضور ان کے حق میں کوئی سفارش نہ کر سکیں گے۔ سورۂ زخرف میں یہ بات زیادہ صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

وَ لَا یَمۡلِکُ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہِ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنۡ شَہِدَ بِالۡحَقِّ وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ۔ (سورۂ زخرف: ۸۶)

''اللہ کو چھوڑ کر جن کو یہ پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کوئی اختیار نہیں رکھتے مگر جو حق کی شہادت دیں گے اور وہ جانتے ہوں گے۔''

شفاعت کرنا صرف ان ہی کے لئے ممکن ہوگا جنہوں نے رحمٰن سے فرمان حاصل کر لیا ہو۔ یہ اعزاز ان ہی کو بخشا جائے گا جو حق کی گواہی دینے والے ہوں گے اور جانتے ہوں گے کہ کون اس بات کے اہل ہیں کہ ان کے حق میں شفاعت کی جائے۔ ان میں انبیاء علیہم السلام پیش پیش ہونگے۔

شفاعت کی ان کڑی شرائط کے پیش نظر مشرکوں اور کافروں کے لئے کوئی بھی شفاعت نہیں کرے گا۔ رہے وہ گنہگار جو اہل ایمان میں سے ہوں گے تو ان میں سے جن کے حق میں اللہ تعالیٰ اجازت دے گا، ان ہی کے لئے شفاعت کی جا سکے گی۔

قرآن کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شفاعت ایک استثنائی صورت ہوگی، جو اللہ تعالیٰ کی مغفرت ہی کی ایک شکل ہے۔ ورنہ نجات کے لئے اصل اصول وہ صالحانہ زندگی ہے جو ایمان کی بنیاد پر بسر کی گئی ہو۔

آج مسلمانوں کی بڑی تعداد شفاعت پر تکیہ کئے ہوئے ہے۔ ان کی زندگیاں بالکل فاسقانہ ہیں مگر وہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں پیدا ہوئے ہیں اس لئے ہمارا بیڑا پار ہے۔ وہ اس خوش فہمی میں اس لئے مبتلا ہیں کہ انہوں نے قرآن کی ان آیتوں کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں، جن میں جزا و سزا کا بے لاگ قانون بیان ہوا ہے مثلاً:

بَلٰی مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ اَحَاطَتۡ بِہٖ خَطِیۡٓـَٔتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ۔ (سورۂ بقرہ:۸۱)

''کیوں نہیں؟ جس نے بھی برائی کمائی اور اس کے گناہوں نے اس کو گھیرے میں لے لیا، تو ایسے ہی لوگ دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

اور یہود کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ آخرت کے بجائے دنیا کے فائدے بٹورنے لگے تھے اور کہتے تھے سَیُغۡفَرُ لَنَا (ہمیں بخشد یا جائے گا)۔

۱۱۲؎ یہ سورہ کی اختتامی آیات ہیں، اس لئے بیان کا رخ پھر اسی گمراہی کی تردید کی طرف ہے جس میں نصاریٰ مبتلا تھے۔ ان کا دعویٰ کہ حضرت مسیح خدا کے بیٹے ہیں ایک ایسی گمراہی تھی، جس نے ان کو توحید کی راہ سے ہٹا کر شرک کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا۔ اور انجیل میں تحریف کی بنا پر اس نے ایک پختہ عقیدہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مثال کے طور پر مرقس کی انجیل کا آغاز ہی اس طرح ہوتا ہے:

'' یسوع مسیح ابن خدا کی خوشخبری کا شروع'' (مرقس: ۱:۱) اس میں بڑی جسارت کے ساتھ حضرت مسیح کو ابن خدا کہا گیا ہے حالانکہ یہ بات اس انجیل میں موجود نہیں تھی جو عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ ''ابن خدا'' کا اضافہ بعد کی چیز ہے اور اس بات کا اعتراف تو بائبل کا شارح کرتا ہے کہ انجیل کے بعض قدیم نسخوں میں ''ابن خدا'' کے الفاظ نہیں تھے:

Some ancient manuscripts have the descriptive phase the Son of God at the end and others do not have it ." (Interpreter's one volume Commentary on the Bible ------- U.S.A.P.645)

سوال یہ ہے کہ اگر موجودہ انجیلیں خدا کا کلام ہیں تو اس کے بعض قدیم نسخوں سے ''ابن خدا'' کے الفاظ غائب کیسے ہوئے؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اصل انجیل میں حضرت مسیح کو ''ابن اللہ'' کہا ہی نہیں گیا تھا۔ پھر مرقس کے انجیل میں تمہیدی فقرہ میں حضرت مسیح کا نسب خدا سے جوڑ دیا گیا ہے، گویا خدا نے ان کو جنم دیا تھا۔ (نعوذ باللہ من ذلک) لیکن لوقا کی انجیل میں ہے کہ جب حضرت مسیح نے بپتسمہ (ایک خاص قسم کا غسل) لیا اس وقت انہیں بیٹا ہونے کا اعزاز بخشا گیا۔

''جب سب لوگوں نے بپتسمہ لیا اور یسوع بھی بپتسمہ پا کر دعا کر رہا تھا تو ایسا ہوا کہ آسمان کھل گیا اور روح القدس جسمانی صورت میں کبوتر کی مانند اس پر نازل ہوا اور آسمان سے آواز آئی کہ تو میرا پیارا بیٹا ہے تجھ سے میں خوش ہوں۔'' (لوقا: ۳:۲۱۔۲۲)

لوقا کے اس بیان سے واضح ہے کہ حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا ہونے کا لقب عطا کیا گیا تھا بالفاظ دیگر وہ متبنیٰ تھے۔ جب کہ مرقس کی انجیل ان کو حقیقی بیٹے کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ انجیلوں کی یہ تضاد بیانی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ''ابنیت'' کی بات ایک گڑھی ہوئی بات ہے، جو انجیل میں داخل کر کے خدا پر زبردست جھوٹ بولا گیا ہے۔ سچی بات وہی ہے جو قرآن کہتا ہے کہ حضرت مسیح نہ حقیقی معنیٰ میں خدا کے بیٹے تھے اور نہ مجازی معنیٰ میں۔ یعنی نہ خدا نے ان کو جنم دیا تھا اور نہ وہ متبنیٰ تھے بلکہ خدا کے عبد، یعنی بندے تھے۔

۱۱۳؎ یعنی اللہ کی طرف بیٹے کی نسبت کو تم معمولی خیال کرتے ہو، حالانکہ یہ ایسی سنگین بات ہے کہ اس پر اللہ کا غضب ٹوٹ پڑے تو عجب نہیں۔ یہ اللہ کی طرف عیب کو منسوب کرنے کے علاوہ اس کی توہین بھی ہے اور اسکی غیرت کو چیلنج بھی۔ اس چیلنج کے نتیجہ میں اللہ کا غضب بھڑک سکتا ہے اور اس کے غضب سے آسمان وزمین کا نظام درہم برہم ہوسکتا ہے۔ لیکن وہ رحمٰن ہے اس لئے وہ اپنے بندوں کو عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا، بلکہ انہیں اپنے طرز عمل کو درست کرنے کا موقع دیتا ہے۔

۱۱۴؎ جب سب پیدائشی بندے ہیں، اور بندے ہی کی حیثیت سے خدا کے حضور حاضر ہونے والے ہیں، تو حضرت عیسیٰ اس سے مستثنیٰ کیسے ہوئے؟ وہ بھی دوسرے بندوں کی طرح بندہ ہی ہیں اور بندہ ہی کی حیثیت سے خدا کے حضور حاضر ہوں گے۔

۱۱۵؎ یعنی سب اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور ہر ہر نفس کی اس نے گنتی کر رکھی ہے۔ کوئی نہیں جو اس کے شمار میں نہ ہو اس لئے اس کے حضور حاضر سب کو ہونا ہوگا۔

۱۱۶؎ یہ خوشخبری ہے جو اہل ایمان کو اس وقت دی گئی جب کہ پوری سوسائٹی ان کی مخالفت میں سرگرم ہوگئی تھی۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں ان کے لئے محبت پیدا کردے گا۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ نبی ﷺ کے یہ ساتھی محبوبِ خلائق بن گئے اور آج بھی مسلمانوں کے دلوں میں صحابۂ کرام کے لئے جو محبت ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ سچے مؤمنوں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں یہ صلہ دیتا ہے کہ اس کے مخلص بندوں کے دلوں میں ان کے لئے محبت پیدا ہوجاتی ہے۔

اس سورہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رحمٰن کا نام بار بار آیا ہے، جو رحمٰن کی صحیح معرفت عطا کرتا ہے۔ اس سے اس کی رحمت کے تقاضے سامنے آتے ہیں اور ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے، جن میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مذہبی دنیا اپنے مہربان خدا کو پہچان نہیں سکی ہے۔

۱۱۷؎ جھگڑالو لوگوں سے مراد عرب ہیں جنہوں نے توحید، رسالت اور آخرت وغیرہ کے بارے میں بڑی بحثیں کھڑی کر دی تھیں۔ اور حق کو آسانی سے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

قرآن کے نزول کا اولین مقصد یہ ہے کہ خدا سے غافل لوگوں کو بُرے انجام سے ہوشیار اور خبردار کر دیا جائے، اور اس سے ڈرنے والوں کو اچھے انجام کی خوشخبری دی جائے۔ قرآن میں یہ باتیں عام فہم اور نہایت سہل انداز میں بیان ہوئی ہیں۔ لہٰذا جن کی زبان عربی ہے یا جنہوں نے عربی زبان سیکھ لی ہے ان کے لئے قرآن کی دعوت کو براہ راست قرآن سے سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ رہے وہ لوگ جو عربی نہیں جانتے تو وہ بھی ترجمہ کی مدد سے قرآن کی دعوت کو بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ البتہ تعبیر واستنباط کا مسئلہ اس سے مختلف ہے، اس کے لئے یقیناً عربی زبان میں مہارت ضروری ہے۔

۱۱۸؎ یعنی تباہ شدہ قوموں کا کوئی وجود نہیں رہا، ان کا غلغلہ اور ان کی ہنگامہ آرائیاں اس طرح ختم ہوگئیں، کہ اب ان کی آہٹ بھی سنائی نہیں دیتی۔ پھر کیا تم بھی اپنی مادی خوشحالیوں میں مگن ان ہی قوموں کے نقش قدم پر چلنا چاہتے ہو؟

۲۰۔ طٰہٰ

نام آغاز میں یہ حروف آئے ہیں۔اس مناسبت سے سورہ کا نام طٰہٰ ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور حضرت عمر کے ایمان لانے سے پہلے (غالباً نبوت کے چھٹے سال) نازل ہو چکی تھی۔کیوں کہ حضرت عمر کے ایمان لانے کا جو واقعہ ابن اسحاق نے بیان کیا ہے، اس میں اس بات کا ذکر ہے کہ ان کی بہن نے ان کو جو صحیفہ دیا تھا اس میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی جب حضرت عمر نے اس کی ابتدائی آیتیں پڑھیں تو بول اٹھے کتنا بہترین اور کیسا شرف والا کلام ہے یہ! (سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۶۷)

مرکزی مضمون وحی و رسالت کی غرض و غایت بیان کرنا، اور اس کا انکار کرنے والوں کو متنبہ کرنا ہے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۸ میں نزولِ قرآن کا مقصد اور اس ہستی کی معرفت پیش کی گئی ہے، جس کے فرمان کی حیثیت سے یہ نازل ہو رہا ہے۔

آیت ۹ تا ۹۸ میں حضرت موسیٰ کو رسالت سے سرفراز کئے جانے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔نیز ان کی دعوت کو پیش کرتے ہوئے ان کی مخالفت کرنے والوں کے بُرے انجام کو پیش کیا گیا ہے۔

آیت ۹۹ تا ۱۱۲ میں حضرت موسیٰ کی سرگزشت سے جو سبق ملتا ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قیامت کے احوال بیان کئے گئے ہیں تا کہ رسالت کا انکار کرنے والے متنبہ ہوں۔

آیت ۱۱۳ اور ۱۱۴ میں بیان کا رخ پھر نزول قرآن کے مقصد کی طرف مڑ گیا ہے۔

آیت ۱۱۵ تا ۱۲۳ میں آدم کی سرگزشت بیان ہوئی ہے اور اس کا یہ پہلو نمایاں کیا گیا ہے کہ نوعِ انسان کا جب اس سرزمین پر آغاز ہوا تو اس پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح کر دی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ انسان کی ہدایت کے لئے وحی و رسالت کا سلسلہ جاری کرے گا۔تو جو لوگ ہدایت الٰہی کی اتباع کریں گے، وہی شیطان کی گمراہی اور اس کے انجام سے محفوظ رہیں گے۔

آیت ۱۲۴ تا ۱۲۹ میں اللہ کی آیتوں سے بے نیاز ہونے کا انجام بیان کیا گیا ہے۔

آیت ۱۳۰ تا ۱۳۲ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطہ سے اہل ایمان کو صبر و استقامت کی ہدایت کی گئی ہے۔اور تسلی دی گئی ہے کہ انجام خیر ان ہی کے لئے ہے۔

آیت ۱۳۳ تا ۱۳۵ میں منکرین کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔

سُوْرَةُ طٰهٰ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰهٰ ①

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ②

اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ③

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ④

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ⑤

لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ⑥

وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفَى ⑦

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ⑧

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ⑨

اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّٓى اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّٓى اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ⑩

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِىَ يٰمُوْسٰٓى ⑪

اِنِّٓى اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ⑫

وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰٓى ⑬

اِنَّنِىْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِىْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ ⑭

۲۰۔ سُورۃُ طٰہٰ

آیات ۱۳۵

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ طا۔ھا۔ ۱؎

۲ ہم نے تم پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ تم مصیبت میں پڑو۔

۳ یہ تو ایک یاددہانی ہے ان کے لئے جو ڈریں۔ ۲؎

۴ اس کا اتارا ہوا ہے جس نے زمین اور بلند آسمان پیدا کئے۔ ۳؎

۵ وہ رحمٰن عرش پر بلند ہے۔ ۴؎

۶ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، جو کچھ زمین میں ہے، جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اور جو کچھ مٹی کے نیچے ہے۔ ۵؎

۷ اگر تم پکار کر بات کہو تو (اس کی شان تو یہ ہے کہ) وہ چپکے سے کہی ہوئی بات اور نہایت مخفی بات تک کو جانتا ہے۔ ۶؎

۸ اللہ کہ سوا کوئی خدا نہیں۔ اسی کیلئے ہیں سب حسن وخوبی کے نام۔ ۷؎

۹ اور کیا تمہیں موسیٰ کے واقعہ کی خبر پہنچی؟ ۸؎

۱۰ جب اس نے آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں سے کہا ذرا ٹھہرو مجھے آگ دکھائی دی ہے (میں جاتا ہوں) تاکہ تمہارے لئے انگارا لے آؤں یا ممکن ہے آگ کے پاس کوئی رہنمائی مل جائے۔ ۹؎

۱۱ جب وہ اس کے پاس پہنچا تو ندا آئی اے موسیٰ!

۱۲ میں ہوں تمہارا رب ۱۰؎۔ اپنی جوتیاں اتار دو۔ تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ ۱۱؎

۱۳ اور میں نے تمہیں چن لیا ہے ۱۲؎، تو جو وحی کی جارہی ہے اسے توجہ سے سنو۔ ۱۳؎

۱۴ میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی خدا نہیں ۱۴؎، تو میری ہی عبادت کرو ۱۵؎۔ اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔ ۱۶؎

۱۔ ''طا'' کا اشارہ ''طُوٰی'' کی طرف ہے جس کا ذکر آیت ۱۲ میں ہوا ہے۔ یہ کوہ سینا کی اس وادی کا نام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔

''ھا'' کا اشارہ ہارون کی طرف ہے جن کا ذکر اس سورہ میں متعدد مقامات پر ہوا ہے۔

حروفِ مقطعات کی مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ نوٹ ا۔ اور سورۂ یونس نوٹ ا۔

۲۔ جن حالات میں اس سورہ کا نزول ہوا ہے وہ اہل ایمان کے لئے نہایت سخت تھے۔ منکرین قرآن نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ جس سے مجبور ہو کر ایک گروہ ہجرت کر کے حبشہ چلا گیا تھا۔ ان حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو ان آیات کے ذریعہ اطمینان دلایا گیا کہ وہ کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ قرآن کا نزول اس لئے نہیں ہوا ہے کہ تم مصیبت میں پڑو۔ بلکہ اس لئے ہوا ہے کہ جو سبق انسان کی لوحِ فطرت پر لکھا ہوا ہے اور غفلت میں پڑے رہنے کی وجہ سے اس نے فراموش کر دیا ہے اس کی یاددہانی ہو۔ ظاہر ہے یہ یاددہانی انسان کے لئے خیر اور سعادت ہی کا باعث ہے۔ کیوں کہ انسان کے لئے سعادت فطرت سے ہم آہنگ ہو کر چلنے میں ہے نہ کہ فطرت سے بغاوت کرنے میں۔ اب اگر بگڑی ہوئی ذہنیت کے لوگ قرآن پر ایمان لانے والوں کی راہ میں کانٹے بچھاتے ہیں تو اس پر صبر کرنا چاہئے۔ کیوں کہ قرآن نے سعادت کی جو راہ تم پر کھولی ہے اسے یہ لوگ کسی صورت میں تم پر بند نہیں کر سکتے، اور وہ انسان کو جو بھولا ہوا سبق یاد دلا رہا ہے اس سے ہر وہ شخص فائدہ اٹھائے گا جس میں کچھ بھی خدا خوفی ہے۔

۳۔ ان آیات میں قرآن کے نازل کرنے والے کی صحیح معرفت بخشی گئی ہے، تا کہ لوگوں کو اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ نہایت عظمت والا کلام ہے جو ایک عظیم ہستی کی طرف سے فرمان کی حیثیت سے نازل ہوا ہے۔

۴۔ تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ اعراف نوٹ۔ ۸۳۔

یہاں اللہ کی یہ صفت کہ وہ رحمٰن ہے، اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ وہ کائنات پر کمال رحمت کے ساتھ فرمانروائی کر رہا ہے۔

۵۔ یعنی اس پوری کائنات کا مالک اللہ ہی ہے، کوئی چیز ایسی نہیں جس کا مالک اس کے سوا کوئی اور ہو۔ وہ مالک ہے اور سب مملوک۔ پھر اس کے سوا کسی کے خدا ہونے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟

۶۔ یعنی اس کے علم کی شان یہ ہے کہ تم کوئی بات علانیہ کہو یا چپکے سے اس پر ہر بات روشن ہے، یہاں تک کہ نہایت مخفی باتیں جو دل ہی دل میں رہتی ہیں۔ وہ بھی۔

۷۔ تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ اعراف نوٹ ۲۷۸۔

۸۔ حضرت موسیٰ کا واقعہ بعد کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمایا ہے۔ یہاں یہ سوال کہ کیا موسیٰ کے واقعہ کی خبر تمہارے پاس پہنچی، شوقِ سماعت پیدا کرنے کے لئے ہے۔

۹۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت موسیٰ مدین میں کئی سال گزارنے کے بعد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مصر لوٹ رہے تھے۔

واضح رہے کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف کے زمانہ سے مصر ہی میں آباد تھے۔ اور حضرت موسیٰ بھی وہیں پیدا ہوئے تھے۔ مگر جوان ہونے کے بعد ایک خاص موقع پر مدین چلے گئے تھے جہاں انہوں نے ایک عرصہ تک قیام کیا۔

مدین سے واپس ہوتے ہوئے وہ صحرائے سینا میں کوہ طور کے پاس سے گذر رہے تھے۔ رات سرد تھی اور راستہ کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یکایک انہیں ایک آگ دکھائی دی۔ انہوں نے گھر والوں سے کہا کہ تم یہاں ٹھہرے رہو میں جا کر آگ کا شعلہ لے آتا ہوں تا کہ تم اپنے کو تاپ سکو۔ اور ممکن ہے وہاں راستہ کا کچھ پتہ چل جائے۔

۱۰؎ جب حضرت موسیٰ آگ کے پاس پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں آواز دی۔ ''میں ہوں تمہارا رب''۔ وحی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ سے براہ راست خطاب فرمائے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا یہ امتیاز ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ہم کلامی کا شرف عطا فرمایا۔ اور ان کی رسالت کا آغاز ہی فرشتہ کے واسطہ کے بغیر اللہ تعالیٰ کے براہ راست خطاب سے ہوا۔

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک ہے کہ وہ کسی مادی چیز میں جو مخلوق ہے حلول کر جائے۔ اس لئے جو آگ موسیٰ علیہ السلام کو دکھائی دی تھی وہ نہ خدا تھی اور نہ خدا نے اس میں حلول کر لیا تھا۔ بلکہ وہ ایک خاص قسم کی روشنی تھی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ انہوں نے اللہ کی نداء اور اس کا کلام ضرور سنا، لیکن انہوں نے اللہ کو دیکھا نہیں۔ قرآن اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ بعد میں جب کوہ طور پر موسیٰ کو شریعت عطاء کرنے کے لئے بلایا گیا تھا، تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ اپنا جلوہ اسے دکھائے۔ ان کی اس درخواست پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا **لَنْ تَرَانِیْ** ''تم مجھے ہرگز دیکھ نہ سکو گے۔'' (سورۂ اعراف: ۱۴۳)

۱۱؎ طُویٰ کوہ طور کی ایک وادی کا نام ہے جو مقدس بن گئی تھی۔ لیکن اب یہ اس نام سے معروف نہیں رہی۔ معلوم ہوتا ہے یہ پوری وادی اس آگ کی روشنی سے جو خاص قسم کی تھی بقعۂ نور بن گئی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہم کلامی بخش رہا تھا۔ اس لئے خاص اہتمام کے ساتھ آدابِ حضوری بجالانے کا حکم ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہوا اپنی جوتیاں اتار دو اور اس کی علت بھی واضح فرمادی کہ اس وقت تم طُویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ اس کا مقدس ہونا ظاہری اور باطنی پہلوؤں سے تھا۔ چونکہ اس سرزمین میں اللہ تعالیٰ کی یہ شان ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ حضرت موسیٰ سے ہم کلام ہو۔ اس لئے اسے شیطان اور اس کے شر سے پوری طرح محفوظ کر دیا گیا تھا اور اس کے ماحول کو بابرکت بنا دیا گیا تھا۔ اس غیر معمولی تقدس کا تقاضا یہ تھا کہ ادب و تعظیم کا معیار بلند رہے اور تواضع کا بھی پوری طرح اظہار ہو۔ جوتیاں اتارنا اس نفسیاتی کیفیت کا مظہر تھا۔ اس لئے اس کا خاص طور سے حکم دیا گیا۔ رہا یہ اشکال کہ پھر جوتے پہن کر۔۔۔۔ اگر وہ صاف ہوں یا مٹی سے رگڑ دیئے گئے ہوں۔۔۔۔ نماز پڑھنا حدیث میں کس طرح جائز قرار دیا گیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سہولت ہے جو اسلام نے عام ضرورت کے پیش نظر دی ہے۔ جب کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو حکم دیا گیا تھا وہ ادب و تعظیم کے خصوصی اہتمام کا تھا۔ کیوں کہ رب العالمین ان سے خود خطاب فرما رہا تھا جسے وہ سن رہے تھے۔ جب کہ نماز میں یہ صورت نہیں ہوتی بلکہ بندہ کی طرف سے مناجات ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کہ ''تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو''۔ فائدہ یہ بھی ہوا، کہ حضرت موسیٰ جو راستہ تلاش کر رہے تھے انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ طویٰ کے مقام پر ہیں۔ ظاہر ہے اس سے آگے کے راستہ کا پتہ چلانا ان کے لئے آسان ہوا ہوگا۔

۱۲؎ یعنی منصبِ رسالت کے لئے۔

۱۳؎ حضرت موسیٰ سفر میں تھے کہ یکا یک انہیں اللہ نے پکارا اور منصب رسالت سے سرفراز فرمایا۔ اس سے واضح ہوا کہ نبوت اور رسالت ایک عطیہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے منتخب بندوں کو نوازتا رہا ہے۔ اس منصب کو کوئی شخص بھی سعی و جہد سے حاصل نہیں کر سکتا۔

موسیٰ علیہ السلام کو منصب رسالت عطا کئے جانے اور ان پر وحی کے نزول کے واقعہ کو بیان کرنے سے مقصود یہ واضح کرنا ہے، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی و رسالت سے سرفراز کئے جانے کا واقعہ انوکھا نہیں ہے۔ بلکہ اس سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ اپنے منتخب بندوں کو اس منصب پر مامور فرماتا رہا ہے، جس کی واضح مثال موسیٰ کا واقعہ ہے۔

۱۴؎ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے جو پہلی تعلیم دی وہ توحید کی تھی۔ یہ وہ اساس ہے جس پر اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہے اور یہ وہ نور ہے جس سے ہدایت کی تمام کرنیں پھوٹ پڑی ہیں۔

۱۵؎ عبادت کی حقیقت، انتہائی محبت کے ساتھ تعظیم کرنا اور اپنی فروتنی کا اظہار کرنا ہے۔ اس کی مستحق خدا ہی کی ذات ہو سکتی ہے۔ جب اللہ کے سوا کوئی خدا

نہیں تو عبادت کا مستحق بھی اس کے سوا کوئی نہیں، اور ایک بندہ کا اس کا بندہ ہونے کی حیثیت سے فرض ہے کہ اس کی عبادت کرے اور یہ شریعت الٰہی کا انسان سے اوّلین مطالبہ ہے۔

۱۶؎ یعنی نماز عبادت کی بہترین شکل ہے۔ لہٰذا اس کا پورا پورا اہتمام کرو اور نماز کا یہ اہتمام اللہ کی یاد کے لئے ہے۔ واضح ہوا کہ نماز کا اصل مقصد اللہ کو یاد کرنا اور اس سے وابستہ ہونا ہے۔ بندہ جب اپنے رب کو یاد کرتا ہے تو بندگی کا تعلق اس سے استوار ہو جاتا ہے۔ انسان کی ساری کامیابی اور اس کے حقیقی ارتقاء کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ اپنے رب سے صحیح تعلق قائم کرے اور اس کو مضبوط بنانے کیلئے کوشاں رہے۔

''ذکر کے معنیٰ دل سے یاد کرنے کے بھی ہیں اور زبان سے کلمات ادا کرنے کے بھی۔ ''نماز کو میرے ذکر کے لئے قائم کرو'' کا مطلب محض زبان سے مخصوص کلمات ادا کرنا نہیں بلکہ دل سے یاد کرتے ہوئے، ان کلمات کو ادا کرنا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ بندہ نماز میں اپنے رب کی طرف متوجہ رہے اور حضور قلب کے ساتھ اس کی حمد وثنا کرے۔

❑❑❑❑❑❑

إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ
كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ ﴿١٥﴾
فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرْدَىٰ ﴿١٦﴾
وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ ﴿١٧﴾
قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا
مَآرِبُ أُخْرَىٰ ﴿١٨﴾
قَالَ أَلْقِهَا يَا مُوسَىٰ ﴿١٩﴾
فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَىٰ ﴿٢٠﴾
قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ ﴿٢١﴾
وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً
أُخْرَىٰ ﴿٢٢﴾
لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَى ﴿٢٣﴾
اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ﴿٢٤﴾
قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴿٢٥﴾
وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ﴿٢٦﴾
وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي ﴿٢٧﴾
يَفْقَهُوا قَوْلِي ﴿٢٨﴾
وَاجْعَلْ لِي وَزِيرًا مِنْ أَهْلِي ﴿٢٩﴾
هَارُونَ أَخِي ﴿٣٠﴾
اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ﴿٣١﴾
وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ﴿٣٢﴾
كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا ﴿٣٣﴾

۱۵ بلاشبہ قیامت کی گھڑی آنے والی ہے ۱۷ ۔ میں اسے پوشیدہ رکھنے کو ہوں، ۱۸ تا کہ ہر شخص اپنی کوشش کے مطابق بدلہ پائے۔ ۱۹

۱۶ جو لوگ اس پر ایمان نہیں رکھتے اور اپنی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے ہیں وہ تمہیں کہیں اس سے روک نہ دیں کہ تم ہلاکت میں پڑو۔ ۲۰

۱۷ اور اے موسیٰ! یہ تمہارے دہنے ہاتھ میں کیا ہے؟

۱۸ عرض کیا یہ میری لاٹھی ہے۔ اس پر میں ٹیک لگاتا ہوں، اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے لئے دوسرے فائدے بھی ہیں۔ ۲۱

۱۹ فرمایا ڈال دو اس کو اے موسیٰ!

۲۰ اس نے اس کو ڈال دیا تو یکایک وہ ایک سانپ بن گیا جو دوڑ رہا تھا۔

۲۱ فرمایا پکڑ لو اس کو اور ڈرو مت۔ ہم اسے پھر اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔ ۲۲

۲۲ اور اپنا ہاتھ اپنے بازو میں دباؤ۔ روشن ہو کر نکلے گا بغیر کسی عیب کے۔ یہ دوسری نشانی ہے۔ ۲۳

۲۳ تا کہ ہم تمہیں اپنی بڑی نشانیاں دکھائیں۔ ۲۴

۲۴ تم فرعون کے پاس جاؤ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے۔ ۲۵

۲۵ عرض کیا: اے رب! میرا سینہ کھول دے۔ ۲۶

۲۶ اور میرا کام میرے لئے آسان کر دے۔ ۲۷

۲۷ اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔ ۲۸

۲۸ تا کہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔

۲۹ اور میرے خاندان سے میرے لئے ایک وزیر مقرر کر دے۔ ۲۹

۳۰ ہارون کو جو میرا بھائی ہے۔ ۳۰

۳۱ اس کے ذریعہ میری کمر مضبوط کر۔

۳۲ اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے۔

۳۳ تا کہ ہم بہ کثرت تیری پاکی بیان کریں۔

۱۷۔ حضرت موسیٰ کو نبوت سے سرفراز کرتے ہوئے جو بنیادی تعلیم دی گئی تھی۔اس میں قیامت کا وقوع اور جزائے عمل کا قانون بھی بیان ہوا تھا۔لیکن موجودہ تورات میں جہاں موسیٰ کے نبوت سے سرفراز کئے جانے کا قصہ بیان ہوا ہے، وہاں اس تعلیم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔(ملاحظہ ہو خروج باب ۳۔ اور ۴۔) اور اتنا ہی نہیں بلکہ پوری تورات میں آخرت کی جزا و سزا کا ذکر مشکل ہی سے کہیں ملے گا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل کتاب جزائے عمل کے قانون کو کس طرح فراموش کر چکے تھے۔اورقرآن نے اس کو کس طرح نمایاں کیا۔

۱۸۔ ''میں اسے پوشیدہ رکھنے کو ہوں'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر چہ قیامت کی گھڑی کو مخفی رکھا گیا ہے، اس لئے کوئی شخص اس کو اس کے آنے سے پہلے نہ اپنے چشم سر سے دیکھ سکتا ہے اور نہ اس کے وقوع کی تاریخ معلوم کر سکتا ہے۔لیکن اسے ایسا مخفی بھی نہیں رکھا گیا ہے کہ اس کے آثار ظاہر نہ ہوں اور اس کے دلائل واضح نہ ہوں۔پس قیامت کا معاملہ پوشیدہ ضرور ہے مگر اس کے باوجود اس کے آثار ظاہر ہوتے رہیں گے۔

۱۹۔ یعنی قیامت اس لئے برپا کی جائے گی تا کہ ہر شخص اپنے عمل کے مطابق بدلہ پائے۔اور پوشیدہ بھی اسی لئے رکھا گیا ہے تا کہ انسان کو امتحان سے گذارا جائے۔اور اس امتحانی زندگی میں اس کی کوشش جیسی کچھ رہی ہوگی، اس کے مطابق اسے قیامت کے دن جزا یا سزا ملے۔

۲۰۔ انسان ماحول سے بہت جلد متاثر ہوتا ہے اور دنیا کا ماحول انکار آخرت اور خواہش پرستی کا ماحول ہے۔ہر زمانہ میں دنیوی ترقی کا راز اسی میں سمجھا گیا ہے کہ انسان خدا کے حضور جوابدہی کی فکر سے آزاد ہو کر زندگی بسر کرے۔پھر اس سلسلہ میں ماحول کا دباؤ بڑا شدید ہوتا ہے۔اگر آدمی ان غلط اور باطل افکار کی طرف سے چوکنا نہ رہے تو ماحول کا سیلاب اسے بہالے جاتا ہے۔اس لئے حضرت موسیٰ کو اور ان کے واسطہ سے ان کے پیروؤں کو یہ ہدایت ہوئی کہ وہ ان لوگوں کی طرف سے چوکنا رہیں جو آخرت کو نہیں مانتے اور خواہشات کے غلام بن کر رہ گئے ہیں۔

۲۱۔ سوال تحقیق کے لئے نہیں تھا۔کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے۔اسے معلوم تھا کہ موسیٰ کے ہاتھ میں کیا تھا۔اس کے باوجود اس نے یہ سوال اس لئے کیا کہ موسیٰ اپنی لاٹھی کو اس کے سانپ بن جانے سے پہلے اچھی طرح شناخت کر لیں۔اور سانپ بن جانے کے بعد انہیں یقین ہو جائے کہ یہ ان ہی کی لاٹھی ہے جو سانپ بن گئی ہے۔

یہ خیال کرنا درست نہیں کہ موسیٰ نے خدا کے سوال کا طویل جواب دیا جو مناسب نہ تھا۔سوال جس انداز میں ہوا اس سے حضرت موسیٰ سمجھ گئے کہ لاٹھی کے بارے میں وضاحت مطلوب ہے کہ وہ کس غرض سے رکھی گئی ہے۔یہ وضاحت حضرت موسیٰ میں یقین راسخ پیدا کرنے کی غرض سے تھی کہ جس لاٹھی سے کبھی کوئی غیر معمولی بات وقوع میں نہیں آئی وہی لاٹھی آج تمہارے سامنے سانپ بن کر دوڑ رہی ہے یہ ایک صریح معجزہ ہے۔

۲۲۔ اس معجزہ کا ذکر تورات میں بھی ہوا ہے:

''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ اس نے کہا لاٹھی۔پھر اس نے کہا اُسے زمین پر ڈال دے۔اس نے اُسے زمین پر ڈالا اور وہ سانپ بن گئی اور موسیٰ اس کے سامنے سے بھاگا تب خداوند نے موسیٰ سے کہا ہاتھ بڑھا کر اس کی دُم پکڑ لے۔اس نے ہاتھ بڑھایا اور اسے پکڑ لیا۔وہ اس کے ہاتھ میں لاٹھی بن گیا۔'' (خروج ۴:۲ تا ۴)

۲۳۔ یہ دوسرا معجزہ تھا جو موسیٰ کو عطا کیا گیا۔وہ اپنا ہاتھ اپنے بازو میں دبا کر نکالتے تو بالکل سفید بن جاتا تھا۔یہ سفیدی برص وغیرہ کی وجہ سے نہیں تھی اور نہ اس میں کوئی عیب پایا جاتا تھا۔اگر ایسا ہوتا تو ہاتھ دوبارہ اپنی اصلی حالت پر لوٹ نہ آتا۔یہ اس کے معجزہ ہونے کا صریح ثبوت تھا۔

بائبل میں اس معجزہ کا ذکر تو ہوا ہے مگر اس کو کوڑھ سے مماثلت دی گئی ہے۔(ملاحظہ ہو خروج ۴:۶) اسی لئے قرآن نے واضح کر دیا کہ ہاتھ بغیر عیب کے سفید ہو جاتا تھا اس سے بائبل کے مذکورہ بیان کی تردید ہوتی ہے۔اور قرآن کے بیان کی حقانیت واضح ہوتی ہے۔کیوں کہ معجزہ لوگوں پر حجت قائم کرنے کے لئے ہوتا ہے اس لئے اس میں عیب کا پہلو نہیں ہو سکتا۔

۲۴۔ یعنی یہ دو نشانیاں ہی نہیں، آگے جا کر تو دوسری بڑی بڑی نشانیاں بھی دیکھو گے۔ چنانچہ بعد میں اس لاٹھی کے ذریعہ کتنی ہی نشانیوں کا ظہور ہوا اور یہی لاٹھی تھی جس کو مارنے سے بنی اسرائیل کے لئے سمندر میں راستہ بن گیا۔

۲۵۔ تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ نازعات نوٹ ۱۳۔

۲۶۔ موسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ رسالت کی ذمہ داری ایک عظیم ذمہ داری ہے۔ اور خاص طور سے فرعون جیسے جابر بادشاہ کو دعوت حق دینا بہت بڑے حوصلے کی بات ہے۔ اس لئے انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ وہ انہیں اس کام کے لئے حوصلہ عطا کرے۔ شرح صدر (سینہ کا کھل جانا) کنایہ ہے حوصلہ کی فراخی، جرأت و ہمت اور طمانیت قلب کے لئے۔

۲۷۔ یعنی جو کام تو نے میرے سپرد کیا ہے اس کی انجام دہی میرے لئے آسان کر دے۔

۲۸۔ زبان کی گرہ سے مراد بولنے میں روانی کی کمی ہے نہ کہ لکنت۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ کی زبان میں لکنت تھی۔ یہ جو قصہ تفسیروں میں بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ نے بچپن میں جب کہ وہ فرعون کے زیر پرورش تھے، منہ میں انگارا ڈال دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی تھی۔ تو یہ اسرائیلیات میں سے ہے اور قابل رد ہے۔ دراصل دعوت کو مؤثر انداز میں پیش کرنے کے لئے خطابت کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ اپنے اندر طلاقت لسانی کی کمی محسوس کر رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ زبان کی اس رکاوٹ کو، کہ وہ روانی کے ساتھ بات نہیں کر سکتے دور کر دے۔

۲۹۔ وزیر یعنی ایسا معاون جو ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ہاتھ بٹا سکے اور نیابت کر سکے۔

۳۰۔ حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے بڑے بھائی تھے، وہ چونکہ نیک بھی تھے اور خطابت و فصاحت میں ممتاز ہونے کی بنا پر دعوتی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے زیادہ اہل تھے اس لئے حضرت موسیٰ نے ان کو نبی بنانے کی درخواست کی۔

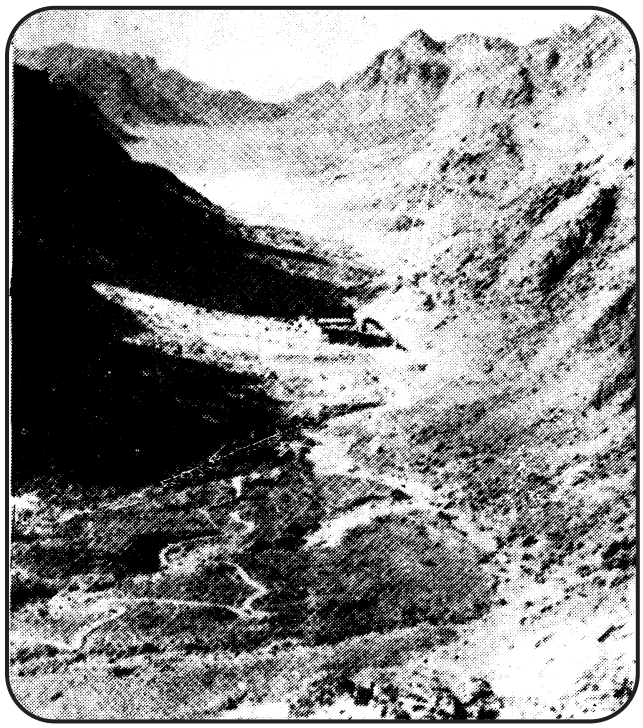

وادیٔ طویٰ

غالباً یہی وہ وادی ہے جہاں حضرت موسیٰ کو آگ دکھائی دی تھی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں پکارا تھا۔ جزیرہ نمائے سینا میں فاران کے نخلستان سے یہ تقریباً ستر کلومیٹر دوری پر واقع ہے یہاں قسطنطین کا بنایا ہوا ایک کنیسہ جو سینٹ کتھرائن کے نام سے مشہور ہے اور ایک مسجد ہے جو سلطان سلیم کی تعمیر کردہ ہے۔

وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۴﴾

۳۴ اور تیرا خوب ذکر کریں۔ ۳۱؎

اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿۳۵﴾

۳۵ بلاشبہ تو ہمارا نگرانِ حال ہے۔

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾

۳۶ فرمایا تمہاری درخواست منظور کر لی گئی اے موسیٰ! ۳۲؎

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿۳۷﴾

۳۷ اور ہم تم پر ایک بار اور احسان کر چکے ہیں۔ ۳۳؎

اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿۳۸﴾

۳۸ جب کہ ہم نے تمہاری ماں کی طرف وحی کی ۳۴؎۔ وہ جو وحی کی جا رہی ہے۔ ۳۵؎

اَنِ اقْذِفِيْهِ فِى التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِى الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّىْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ۭ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّىْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰي عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾

۳۹ کہ اس کو صندوق میں رکھ دو پھر اس (صندوق) کو دریا میں چھوڑ دو۔ دریا کو چاہئے کہ اس کو کنارہ پر ڈال دے اور اسے وہ شخص اٹھا لے جو میرا بھی دشمن ہے اور اس (بچہ) کا بھی ۳۶؎۔ اور میں نے تم پر اپنی طرف سے محبت ڈال دی تھی ۳۷؎۔ اور یہ اس لئے کیا تھا کہ تمہاری پرورش میری نگرانی میں ہو۔ ۳۸؎

اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي مَنْ يَّكْفُلُهٗ ۭ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۭ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۭ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۙ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰي قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿۴۰﴾

۴۰ جب تمہاری بہن (پیچھے پیچھے) جا رہی تھی ۳۹؎۔ کہنے لگی میں تمہیں (ایسی عورت) بتاؤں جو اس کی پرورش کرے ۴۰؎۔ اس طرح ہم نے تمہیں تمہاری ماں کی طرف لوٹا دیا تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم نہ کرے ۴۱؎۔ اور تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تو ہم نے تم کو غم سے نجات دی ۴۲؎۔ اور تمہیں طرح طرح سے آزمایا ۴۳؎۔ اور تم کئی سال سے مدین والوں میں رہے ۴۴؎۔ پھر تم ٹھیک وقت پر آ گئے اے موسیٰ! ۴۵؎

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴿۴۱﴾

۴۱ میں نے تمہیں اپنے (خاص کام) کے لئے منتخب کیا ہے۔ ۴۶؎

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿۴۲﴾

۴۲ تم اور تمہارا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ جاؤ اور میرے ذکر میں کوتاہی نہ کرو۔ ۴۷؎

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾

۴۳ جاؤ فرعون کے پاس وہ سرکش ہو گیا ہے۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾

۴۴ اس سے نرمی سے بات کرو ۴۸؎۔ ممکن ہے وہ یاد دہانی حاصل کرے اور ڈر جائے۔ ۴۹؎

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۵﴾

۴۵ انہوں نے عرض کیا ۵۰؎۔ اے ہمارے رب! ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے یا سرکشی کرے۔ ۵۱؎

۳۱۔ حضرت موسیٰ کو جب نبوت عطا ہوئی تو ان پر گہرے حقائق و معانی کا بھی انکشاف ہوا۔ وہ سمجھ گئے کہ کارِ نبوت میں جو چیز اہمیت رکھتی ہے اور جس کو ایک اعلیٰ مقصد کی حیثیت سے تمام کاموں میں پیش نظر رکھنا چاہئے، وہ ہے اللہ کی پاکی بیان کرنا اور اس کا خوب ذکر اور چرچا کرنا۔ مسئلہ سیرت سازی کا ہو یا دعوت و تبلیغ یا رہنمائی اور قیادت کا، تمام امور و مسائل میں اس عبادت کو اس کے شایانِ شان طریقہ پر ادا کرنا ضروری ہے۔

۳۲۔ حضرت موسیٰ کو جب اللہ تعالیٰ نے منصب رسالت سے سرفراز فرمایا، تو وہ اس کی ذمہ داریوں کے احساس سے گرانبار ہو رہے تھے۔ ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی یہ دعا، بارگاہ الٰہی میں شرف قبولیت حاصل کر گئی اور جو کچھ انہوں نے مانگا سب دیا گیا۔

۳۳۔ قبولیت دعا کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی ان نوازشوں کا ذکر فرمایا جو اس نے موسیٰ پر نبوت سے پہلے فرمائی تھیں۔ تاکہ واضح ہو جائے کہ موسیٰ پر ان کی پیدائش کے وقت ہی سے اللہ کی خاص نظر عنایت رہی ہے، اور وہ قدم قدم پر ان کی دستگیری کرتا رہا ہے۔ پھر نبوت کے بعد وہ ان کی مدد کیسے نہیں کرے گا؟ اور ان کی ڈھارس بندھ جائے کہ جب ان کی پرورش کے لئے اللہ کی طرف سے کرشمہ قدرت کا ظہور ہوا تھا تو جس کٹھن مہم پر ان کو بھیجا جا رہا ہے، اس کے لئے اس کے کرشموں کا ظہور کیوں نہیں ہوگا؟

۳۴۔ یہ وحی القاء (دل میں کوئی بات ڈالنا) کے معنیٰ میں نہیں ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ سورۂ قصص میں بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ کی والدہ کو یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ اس بچہ کو ہم تمہارے پاس لوٹا دیں گے اور اسے ہم رسول بنانے والے ہیں۔ ظاہر ہے صراحت کے ساتھ یہ بات اسی صورت میں انہیں معلوم ہو گئی ہوگی جب کہ الفاظ کے پیرایہ میں انہوں نے سنی ہوگی، اس لئے ان کے پاس وحی غیبی آواز کی صورت میں آئی ہوگی۔ واللہ اعلم باسرار کلامہ۔

یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ وحی کا کسی غیر نبی کی طرف بھیجا جانا ایک شاذ اور استثنائی صورت ہے۔ حضرت موسیٰ کی والدہ اور حضرت مریم کے ساتھ وحی کا معاملہ وقتی اور محدود تھا اور یہ ایک استثنائی صورت تھی۔ نیز اس وحی کا تعلق درحقیقت حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ جیسے نبیوں کی ولادت سے تھا۔ اور بعد میں ان نبیوں کے ذریعہ اس وحی کی تصدیق بھی ہوئی۔ اس لئے وحی کے ان واقعات میں جھوٹے مدعیان نبوت کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔

۳۵۔ یعنی اے موسیٰ تمہاری ماں کی طرف جو باتیں وحی کی گئی تھیں وہ تمہیں وحی کے ذریعہ بتائی جا رہی ہیں۔۔۔ آگے اس کا ذکر ہے۔

۳۶۔ یہ قصہ سورۂ قصص میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ یہاں ہم اس واقعہ کا پس منظر مختصراً بیان کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل حضرت یوسف کے زمانہ میں فلسطین سے مصر منتقل ہو گئے تھے۔ چند صدیوں میں ان کی آبادی وہاں خوب بڑھ گئی۔ جب فرعون برسر اقتدار آیا تو اس نے ان کی آبادی کے بڑھ جانے کا خطرہ محسوس کیا۔ چونکہ بنی اسرائیل اسلام کے پیرو تھے اور مصری مشرکانہ مذہب کے، اس لئے فرعون اور حکمراں طبقہ بنی اسرائیل کے بارے میں بڑے تعصب میں مبتلا ہوا اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے لگا یہاں تک کہ فرعون نے ان کی تعداد کو گھٹانے کے لئے ان کے بچوں یعنی لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کرنے کا حکم دیا۔ موسیٰ جب پیدا ہوئے تو ان کی والدہ نے انہیں چھپایا، لیکن یہ معاملہ کب تک ڈھکا چھپا رہتا۔ فرعونیوں کو خبر ہوتی تو وہ اس بچہ کو بھی قتل کر دیتے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے ان کی حفاظت اور ان کی پرورش کا غیر معمولی سامان کیا۔ موسیٰ کی والدہ کو بصورت وحی یہ ہدایت ہوئی کہ ایک صندوق میں بچہ کو رکھ کر دریا میں چھوڑ دے۔ اور دریا کو یہ حکم ہوا کہ وہ صندوق کو کنارے پر ڈال دے۔ چنانچہ موسیٰ کی والدہ نے اسی ہدایت پر عمل کیا اور وہ صندوق ایسی جگہ پر کنارے لگا جہاں فرعون اپنی بیوی کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے اپنے آدمی کے ذریعہ صندوق کو حاصل کر لیا۔ اس طرح موسیٰ اس شخص کے پاس پہنچ گئے جو خدا کا بھی دشمن تھا اور ان کا بھی۔ یہ اللہ کا کرشمۂ قدرت تھا۔ اس کے بعد دوسرے جن کرشموں کا ظہور ہوا ان کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

۳۷۔ یعنی بچہ کو نہایت پیاری اور موہنی صورت والا بنایا گیا تھا تاکہ دیکھ کر کسی کو بھی رحم آئے۔ اللہ کی یہ تدبیر ایسی تھی کہ فرعون اپنی سنگدلی کے باوجود اس کو قتل کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو سکا، اور جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ بائبل میں بھی بچہ کے خوبصورت ہونے کا ذکر ہے:۔

''وہ عورت حاملہ ہوئی اور اس کے بیٹا ہوا اور اس نے یہ دیکھ کر کہ بچہ خوبصورت ہے تین مہینے تک اسے چھپا کر رکھا۔'' (خروج: ۲۔۲)

۳۸۔ یعنی ان نازک حالات میں اللہ نے موسیٰ کی پرورش کا خصوصی انتظام کیا۔

۳۹۔ جب موسیٰ کو صندوق میں رکھ کر دریا کے سپرد کر دیا گیا، تو ان کی بہن خاموشی کے ساتھ اس صندوق کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی، تا کہ دیکھے کہ اس صندوق کیساتھ کیا معاملہ پیش آتا ہے۔

۴۰۔ صندوق کو فرعون کے گھر والوں میں سے کسی نے اٹھالیا اور فرعون اور اس کی بیوی کے پاس لے گیا۔ فرعون کا محل غالباً دریائے نیل کے کنارے تھا اس لئے کنارے کے پاس گھر کا کوئی نہ کوئی فرد موجود رہا ہوگا۔ بائبل کا بیان ہے کہ فرعون کی بیٹی وہاں موجود تھی اور اس نے صندوق لے لیا تھا۔(خروج ۲:۵)

بچہ جب فرعون کے گھر پہنچ گیا تو فرعون کی بیوی اسے دیکھ کر خوش ہوگئی۔ اور فرعون کو اس بات کیلئے آمادہ کیا کہ اس کی پرورش کی جائے، مگر بچہ کسی عورت کا دودھ پینے کے لئے تیار نہ ہوا اس لئے اس کو بڑی تشویش ہوئی۔ موسیٰ کی بہن جو دور سے دیکھ رہی تھی قریب آئی جب اسے معلوم ہوا کہ بچہ کے لئے دودھ پلانے والیوں کو طلب کیا جا رہا ہے تو اس نے انہیں بتلایا کہ فلاں گھر میں اس کی پرورش کا انتظام ہوسکتا ہے۔ یہ گھر ان کی اپنی والدہ کا تھا مگر راز کو فاش کئے بغیر اس نے یہ مشورہ دیا۔

۴۱۔ موسیٰ کی بہن کے مشورہ کو فرعون کے گھر والوں نے قبول کرلیا۔ اور اس کو اس انا کے حوالہ کر دیا جس کا مشورہ موسیٰ کی بہن نے دیا تھا، یعنی موسیٰ کی والدہ۔ اس طرح بچہ پرورش کے لئے دوبارہ موسیٰ کی والدہ کی گود میں پہنچ گیا۔ اللہ کا یہ وعدہ کہ ہم اسے تمہارے پاس لوٹائیں گے ایک کرشمہ کی صورت میں پورا ہوا۔

۴۲۔ یہ قصہ بھی سورۂ قصص میں بیان ہوا ہے۔ موسیٰ جب بڑے ہوئے تو ایک دن یہ واقعہ پیش آیا، کہ دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے دیکھ کر وہ مظلوم کی مدد کے لئے گئے۔ مظلوم اسرائیلی تھا اور زیادتی کرنے والا قبطی۔ انہوں نے قبطی کو جوں ہی گھونسا مارا اس کی موت واقع ہوگئی۔ موسیٰ کا ارادہ اس کو جان سے مارنے کا نہیں تھا لیکن یہ غلطی ان سے سرزد ہوگئی جس کا انہیں ملال رہا۔ اس کی اطلاع جب فرعون کو ہوئی تو اس نے موسیٰ کو قتل کرنے کی غرض سے ان کی گرفتاری کے احکام جاری کر دئے۔ موسیٰ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ مصر چھوڑ کر مدین چلے گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی نجات کا سامان کر دیا۔

۴۳۔ حضرت موسیٰ کی پوری زندگی آزمائشوں کی زندگی رہی ہے۔ ان آزمائشوں میں جب وہ پورے اترے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں نہایت بلند مقام عطا فرمایا۔ معلوم ہوا کہ انسان کی آزمائشوں میں خوب تربیت ہوتی ہے اور وہ ان سے گزر کر اہم خدمات انجام دینے کے لائق بنتا ہے۔

۴۴۔ حضرت موسیٰ مصر سے نکل کر قریبی ملک مدین پہنچ گئے تھے، جہاں انہوں نے کئی سال گزارے۔ تفصیل سورۂ قصص میں آ رہی ہے۔

۴۵۔ یعنی نبوت عطا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو وقت مقرر کیا تھا ٹھیک اس وقت پر پہنچ گئے۔

۴۶۔ مراد کارِ نبوت ہے۔

۴۷۔ یعنی دل سے مجھے خوب یاد رکھو، زبان سے بہ کثرت میرا ذکر کرو اور لوگوں میں میرا خوب چرچا کرو۔ اس فریضہ کی ادائیگی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔

۴۸۔ فرعون بڑا سرکش اور مغرور تھا۔ مگر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنے کی ہدایت دی گئی، تا کہ دعوت اس کے سامنے اپیلنگ کے انداز میں آ جائے اور وہ غور و فکر کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ داعی کو اپنے لب و لہجہ میں مخاطب کی نفسیات کا لحاظ کرنا چاہئے۔

۴۹۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ فرعون دعوت قبول نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود موسیٰ کو یہ ہدایت ہوئی کہ وہ اس کے بارے میں قبول دعوت کے امکان کو نظر انداز نہ کریں۔ یعنی داعی کے حیثیت سے تو انہیں اپنی ذمہ داری اسی طرح انجام دینی چاہئے کہ جس کے سامنے وہ دعوت پیش کر رہے ہیں کیا عجب کہ وہ اُسے قبول کر لے۔ اگر اس بات کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو نہ داعی اپنی ذمہ داریاں کما حقہ ادا کر سکتا ہے، اور نہ ان لوگوں پر حجت قائم ہوسکتی ہے جن کے سامنے دعوت پیش کی جا رہی ہے۔

یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ اللہ کی عظمت کے تصور سے اس کا ڈر اور خوف (خشیت کا) پیدا ہو جانا اولین اور بنیادی بات ہے۔ جب یہ چیز پیدا ہو جاتی ہے تو دل یاددہانی (تذکر) حاصل کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ پھر ہر وہ بات جو حق ہے اس کے دل میں اترنے لگتی ہے چنانچہ سورۂ اعلیٰ میں ارشاد ہوا ہے۔ **سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى** ''یاددہانی حاصل کرے گا وہ جو (اپنے رب سے) ڈرتا ہے''۔

لہٰذا فرعون کے بارے میں یہ جو فرمایا کہ ''ممکن ہے وہ یاددہانی حاصل کرے یا ڈر جائے۔'' تو یہ اس معنیٰ میں حضرت موسیٰ کو ہدایت تھی، کہ یہ توقع رکھتے ہوئے اس سے نرمی سے بات کرو کہ وہ یاددہانی حاصل کرے گا۔ لیکن اگر یہ مقصد ابھی پوری طرح حاصل نہیں ہوتا اور اس میں کچھ خدا خوفی ہی پیدا ہو جاتی ہے، تو گویا بنیادی طور پر زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ اس کے بعد دل و دماغ کے بدل جانے کی بھی توقع کی جا سکتی ہے۔

۵۰؎ ادھر موسیٰ کو فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا گیا، ادھر ہارون کی طرف وحی کر کے انہیں بھی یہی حکم دیا گیا۔ اس موقع پر دونوں نے فرعون کے بارے میں اندیشہ کا اظہار کیا اس لئے یہاں دونوں کی بات کو سمیٹ کر پیش کیا گیا ہے۔

۵۱؎ یعنی ظاہری حالات سے تو اس بات کا اندیشہ محسوس ہوتا ہے، کہ وہ توحید کی بات سنتے ہی ظلم و زیادتی پر اتر آئے گا یا اپنی سرکشی کا مظاہرہ کرے گا۔

قَالَ لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ ﴿٤٦﴾

۴۶ فرمایا ڈرو مت میں تمہارے ساتھ ہوں۔ سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔

فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي
إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۖ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ ۖ وَالسَّلَامُ
عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ ﴿٤٧﴾

۴۷ اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کے رسول ہیں۔ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے ۵۲۔ اور ان کو تکلیف نہ دے ۵۳۔ ہم تیرے رب کی طرف سے نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ ۵۴۔

إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴿٤٨﴾

۴۸ اور ہم پر وحی کی گئی ہے کہ عذاب ہے اس کے لئے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔ ۵۵۔

قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يَا مُوسَىٰ ﴿٤٩﴾

۴۹ اس نے کہا تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ؟ ۵۶۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ ﴿٥٠﴾

۵۰ موسیٰ نے کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو وجود بخشا پھر اس پر راہ کھول دی۔ ۵۷۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ ﴿٥١﴾

۵۱ اس نے سوال کیا پھر گزری ہوئی قوموں کا کیا حال ہے؟

قَالَ عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَابٍ ۖ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى ﴿٥٢﴾

۵۲ موسیٰ نے جواب دیا اس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتہ میں ہے۔ میرا رب ایسا نہیں ہے کہ اس سے غلطی یا بھول ہو جائے۔ ۵۸۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَسَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا
وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّن نَّبَاتٍ شَتَّىٰ ﴿٥٣﴾

۵۳ وہ، جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا ۵۹، اس میں تمہارے لئے راہیں نکالیں اور آسمان سے (اوپر سے) پانی برسایا پھر اس نے مختلف قسم کی نباتات پیدا کر دیں۔

كُلُوا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ ﴿٥٤﴾

۵۴ کھاؤ اور چراؤ اپنے چوپایوں کو۔ اس میں نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کے لئے۔

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ﴿٥٥﴾

۵۵ اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا، اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے دوبارہ تم کو نکالیں گے۔ ۶۰۔

وَلَقَدْ أَرَيْنَاهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ ﴿٥٦﴾

۵۶ ہم نے اس کو اپنی ساری نشانیاں دکھائیں مگر اس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔ ۶۱۔

قَالَ أَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ أَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يَا مُوسَىٰ ﴿٥٧﴾

۵۷ اس نے کہا اے موسیٰ کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ اپنے جادو کے زور سے ہمیں ہمارے ملک سے نکال باہر کرو؟ ۶۲۔

۵۲۔ یہ آیت اس بات میں صریح ہے کہ حضرت موسیٰ کو جب فرعون کے پاس بھیجا گیا تو انہیں دعوت کے ساتھ یہ مطالبہ بھی پیش کرنے کی ہدایت دی گئی کہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ جانے دیا جائے۔ یہ مطالبہ چونکہ اہم دینی مصالح کے پیش نظر تھا اس لئے آغاز ہی میں اس کو پیش کرنے کی ہدایت ہوئی۔ اس مسئلہ پر ہم تفصیلی گفتگو سورۂ اعراف نوٹ ۱۶۱ میں کر آئے ہیں۔ اس کو اس موقع پر پیشِ نظر رکھا جائے۔

۵۳۔ معلوم ہوا کہ اگر کوئی طاغوتی حکومت مسلمانوں پر ظلم ڈھاتی ہو تو اس سے یہ مطالبہ کرنا، کہ وہ ان پر ظلم وزیادتی نہ کرے دین کا تقاضا ہے۔ اسے دعوتی مصالح کے خلاف سمجھنا صحیح نہیں۔ داعی کو مظلوم کی حمایت بہر حال کرنا ہوگی خواہ اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم کرے یا بُری۔

۵۴۔ یہ ہدایت الٰہی کی پیروی کی دعوت بھی تھی اور اس بات سے آگاہی بھی، کہ اسی کا انجام بخیر ہے جو ہدایت کو قبول کرے اور اس کی روشنی میں چلے۔

۵۵۔ بات تو اس طرح بھی کہی جا سکتی تھی کہ اے فرعون اگر تو نے جھٹلایا تو تجھے عذاب بھگتنا ہوگا۔ مگر حضرت موسیٰ کو ہدایت ہوئی کہ اس سے کہیں ''ہم پر وحی کی گئی ہے کہ عذاب ہے اس کیلئے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔'' یہ نہایت حکیمانہ اسلوب تھا جس میں عمومیت کے ساتھ ہر جھٹلانے والے کا انجام بیان کر دیا گیا تھا، تا کہ فرعون اسے اپنی ذات پر حملہ خیال نہ کرے بلکہ اصولی بات کے پیش نظر غور وفکر کیلئے آمادہ ہو جائے، ساتھ ہی اس پر یہ بھی واضح ہو جائے کہ عذاب کی یہ تنبیہ وحی الٰہی کی ہدایت کے تحت ہے۔

۵۶۔ یعنی جب فرعون کے پاس حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون پہنچے اور اس کے سامنے دعوت پیش کی تو اس نے موسیٰ سے یہ سوال کیا۔

۵۷۔ فرعون اس بات کا مدعی تھا کہ وہ خود ہی رب اعلیٰ ہے۔ مگر حضرت موسیٰ نے صاف طور سے اس سے کہا کہ وہ تو اپنا رب خالق کائنات کو مانتے ہیں۔ ان کے اس جواب میں یہ دلیل مضمر تھی کہ جو خالق ہے وہی درحقیقت رب ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس نے ہر چیز کو وجود بخشنے کے بعد اس پر اس کے مناسب حال راہِ عمل بھی کھول دی ہے۔ جانور گھاس کھاتا ہے پتھر نہیں کھاتا، یہ کس کی رہنمائی ہے؟ شہد کی مکھی دور دور سے پھولوں کا رس چوس کر لاتی اور چھتے میں جمع کرتی ہے، یہ کام وہ کس کی ہدایت پر انجام دیتی ہے؟ ظاہر ہے یہ جبلی ہدایت ہے جو ان کے خالق نے ان کے اندر ودیعت کی ہے۔ اسی طرح نباتات اور جمادات بھی اپنے اپنے فرائض ایک خاص طریقہ پر انجام دیتے رہتے ہیں۔ درخت زمین سے غذا حاصل کر کے پھل دینے لگتا ہے اور دریا ڈھلوان کی طرف بہتا ہے۔ یہ سب کچھ کس کے اشارہ پر ہوتا ہے؟ جب واقعہ یہ ہے کہ ہر چیز اپنے خالق سے اشارہ پا کر راہ عمل طے کر رہی ہے، تو انسان کا ہادی ورہنما بھی درحقیقت وہی ہے اور اسی کی ہدایت انسانی زندگی کے لئے فی الواقع ہدایت ہے۔

۵۸۔ فرعون کا یہ سوال کہ پھر گزری ہوئی قوموں کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ وہ کیا سب گمراہ تھیں؟ محض الجھا دینے کے لئے تھا۔ مگر حضرت موسیٰ نے ایک اصولی بات بیان کر کے فرعون کے ذہن کو اصل نقطۂ دعوت، یعنی توحید پر مرکوز کرنے کا سامان کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ گذشتہ قوموں کا جو حال بھی رہا ہو میرے رب کو اس کا علم ہے، اور اس نے ہر ایک کے اعمال لکھ رکھے ہیں۔ اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی کہ ایک کا عمل دوسرے کے کھاتہ میں جمع ہو جائے اور نہ وہ بھولتا ہے کہ کسی کے واقعی اعمال اسے یاد نہ رہیں۔

۵۹۔ حضرت موسیٰ کے بیان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اضافہ ہے تا کہ قارئینِ قرآن کے سامنے توحید کا پہلو اور زیادہ روشن ہو۔

۶۰۔ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے وہ مر کر مٹی ہی میں مل جاتا ہے اور قیامت کے دن اُس کو اُسی زمین سے اٹھا کھڑا کیا جائے گا۔ انسان خواہ سمندر میں مرے یا ہوا میں یا خلا میں، اس کا حشر بہر حال اسی زمین پر ہوگا۔

۶۱۔ یعنی وہ تمام نشانیاں جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی رسالت کو ثابت کرنے اور حق کو واضح کرنے کے لئے ضروری تھیں۔

۶۲۔ یہ ایک جھوٹا الزام تھا جو فرعون نے حضرت موسیٰ پر لگایا۔ ورنہ حضرت موسیٰ نے فرعون والوں کو مصر سے نکال باہر کرنے کا کوئی سیاسی پروگرام نہیں بنایا تھا۔ بلکہ وہ خود بنی اسرائیل کو لے کر ملک مصر سے چلے جانا چاہتے تھے اور اس مہم میں رکاوٹ نہ ڈالنے کا فرعون سے مطالبہ کیا تھا۔ اس لئے فرعون کا حضرت موسیٰ پر یہ الزام کہ تم ہمیں اپنے ملک سے نکالنا چاہتے ہو ایسا ہی تھا جیسا کہ ان پر جادو کا الزام۔

فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ
مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾

۵۸ تو ہم بھی تمہارے مقابلہ میں ایسا ہی جادو لائیں گے ۔تم ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر کرلو ۶۳؎ ۔ نہ ہم اس کی خلاف ورزی کریں اور نہ تم ۔ایک ہموار میدان میں ۔ ۶۴؎

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾

۵۹ (موسیٰ نے) کہا تمہارے لئے جشن کا دن مقرر ہے ۔اور لوگوں کو دن چڑھے جمع کیا جائے ۔ ۶۵؎

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾

۶۰ پھر فرعون پلٹا، اپنے تمام داؤ اکٹھا کئے اور مقابلہ میں آ گیا ۔ ۶۶؎

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا
فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿۶۱﴾

۶۱ موسیٰ نے کہا تمہاری شامت ! اللہ پر جھوٹ نہ باندھو کہ عذاب سے تمہیں تباہ کردے ۔اور جس نے جھوٹ گھڑا وہ نامراد ہوا ۔ ۶۷؎

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾

۶۲ یہ سن کر ان کے درمیان رد و کد ہونے لگی اور وہ چپکے چپکے سرگوشیاں کرنے لگے ۔ ۶۸؎

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ
بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾

۶۳ کہنے لگے ۶۹؎ ۔ یہ دونوں جادوگر ہیں ۔ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے نکال باہر کریں اور تمہارے بہترین مذہب کو ختم کر کے رکھ دیں ۔ ۷۰؎

فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿۶۴﴾

۶۴ لہٰذا اپنے سارے داؤ اکٹھا کرلو اور ایک صف بنا کر آؤ ۔ ۷۱؎ آج اسی کی جیت ہوگی جو غالب آ گیا ۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿۶۵﴾

۶۵ انہوں نے کہا موسیٰ یا تم ڈالو یا ہم پہلے ڈالتے ہیں ۔

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ
اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۶﴾

۶۶ اس نے کہا نہیں تم ہی ڈالو ۷۲؎ ۔ اچانک ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کی وجہ سے اس کو دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں ۔ ۷۳؎

فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿۶۷﴾

۶۷ اور موسیٰ نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا ۔ ۷۴؎

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿۶۸﴾

۶۸ ہم نے کہا ڈرو مت ۔تم ہی غالب رہو گے ۔

وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا
صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾

۶۹ تمہارے دہنے ہاتھ میں جو (لاٹھی) ہے اسے ڈال دو ۔ انہوں نے جو کچھ بنایا ہے اس کو وہ نگل جائے گا ۷۵؎ ۔ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے جادوگر کا فریب ہے ۷۶؎ ۔ اور جادوگر کامیاب نہیں ہوسکتا خواہ کسی راہ سے آئے ۔ ۷۷؎

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴿۷۰﴾

۷۰ بالآخر جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے ۷۸؎ ۔ وہ پکار اٹھے ہم ایمان لائے موسیٰ اور ہارون کے رب پر ۔ ۷۹؎

۶۳؎ حضرت موسیٰ نے اپنی لاٹھی کے سانپ بن جانے کا معجزہ فرعون کو دکھایا۔لیکن اس نے اسے جادو قرار دیا۔اور چیلنج کیا کہ ہم بھی ایسا جادو بنا کر لا سکتے ہیں۔تم مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ اور دن مقرر کر لو۔

۶۴؎ یعنی مقابلہ کھلے میدان میں ہو تا کہ سب دیکھ سکیں۔

۶۵؎ ''یوم الزینۃ'' جشن کے دن کا انتخاب حضرت موسیٰ نے اس لئے کیا، تا کہ لوگ آسانی سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع ہو سکیں اور معجزہ الٰہی کا مشاہدہ کر سکیں۔یہ دن قومی تہوار کا رہا ہوگا۔

دن چڑھنے کا وقت حضرت موسیٰ نے اس لئے مقرر کیا، تا کہ لوگ خوب روشنی میں ان کے معجزہ کو دیکھ لیں، اور ان کی لاٹھی کے سانپ بن جانے میں ان کو کوئی شبہہ نہ رہے۔

۶۶؎ یعنی اس مجلس کے برخاست ہو جانے کے بعد فرعون سازش کی تیاری میں لگ گیا۔اور منصوبہ بنایا کہ ملک کے گوشہ گوشہ سے ماہر جادوگروں کو بلایا جائے، تا کہ وہ سب اکٹھے ہو کر اپنا کرتب دکھائیں اور اس معجزہ سے لوگوں پر یہ بات واضح ہو جائے، کہ موسیٰ کی لاٹھی کا سانپ بن جانا خدا کا معجزہ نہیں بلکہ یہ موسیٰ کی محض جادوگری ہے۔چنانچہ وہ اپنے ان ہتھکنڈوں کے ساتھ ماہر جادوگروں کو لئے ہوئے جشن کے دن مقابلہ کے لئے میدان میں آ گیا۔

۶۷؎ حضرت موسیٰ کا یہ خطاب فرعونیوں اور جادوگروں سے تھا، جس میں انہوں نے خبردار کیا کہ اللہ کے معجزہ کو جادو اور اس کے رسول کو جادوگر قرار دینا اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔اور جو شخص بھی اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے وہ اللہ کے عذاب کو دعوت دیتا ہے۔ایسے لوگوں کے حصہ میں نامرادی کے سوا کچھ نہیں آ سکتا۔

۶۸؎ حضرت موسیٰ کی اس بروقت تنبیہ کو سن کر جادوگر شش و پنج میں پڑ گئے۔چپکے چپکے آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے کہ مقابلہ کیا بھی جائے یا نہیں۔

۶۹؎ کہنے والے فرعون کے درباری رہے ہوں گے۔

۷۰؎ اسی طرح ان درباریوں نے اشتعال اور تعصب پیدا کرنے کی کوشش کی، تا کہ جادوگر جوش و خروش کے ساتھ مقابلہ کے لئے سامنے آئیں۔

۷۱؎ یعنی تمہارے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے، بلکہ موسیٰ اور ہارون کے مقابلہ میں تم سب جادوگروں کا ایک متحدہ محاذ ہونا چاہئے۔

۷۲؎ حضرت موسیٰ نے اس بات کو ترجیح دی کہ پہلے جادوگر اپنا کرتب دکھائیں۔پھر وہ اپنا معجزہ پیش کریں۔باطل کی تاریکی کے بعد حق کی روشنی ظاہر ہو۔

۷۳؎ معلوم ہوا کہ جادو کسی چیز کی ماہیت کو نہیں بدلتا بلکہ محض فریب نظر اور فریبِ خیال ہے۔جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں واقعی سانپ نہیں بن گئی تھیں، بلکہ ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ وہ سانپ کی طرح دوڑ رہی ہیں۔سورۂ اعراف میں ہے:

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ۔(اعراف ۔ ۱۱۶)

''پھر جب انہوں نے (اپنی رسیاں اور لاٹھیاں) ڈال دیں تو لوگوں کی نگاہیں جادو سے مار دیں۔''

اور جہاں تک حضرت موسیٰ کا تعلق ہے قرآن کہتا ہے يُخَيَّلُ اِلَيْهِ ''ان کو ایسا خیال ہوا'' کہ جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں۔ وہ بھی اس صورت میں کہ وہ پہلے ہی سے جانتے تھے کہ جو کچھ جادوگر پیش کرنے والے ہیں وہ محض جادو ہے نہ کہ حقیقۃً اشیاء کی قلب ماہیت۔پھر یہ چیز بھی تھوڑی دیر کے لئے تھی اس کے بعد ان کا طلسم ٹوٹ گیا۔اور جادو کی یہ نظر بندی تھوڑی دیر ہی کے لئے ہوتی ہے اس کے بعد وہ غائب ہو جاتا ہے۔اس لئے یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ حضرت موسیٰ پر نبی ہونے کے باوجود جادو کا اثر ہوا تھا۔''جادو کا اثر ہونا'' اور بات ہے اور ''جادو کو دیکھ لینا'' اور بات۔حضرت موسیٰ نے جادو کو دیکھ لیا تھا ان پر جادو کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ان کے ذہنی قویٰ صحیح سلامت تھے۔انہوں نے لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپ کی شکل میں جو دیکھا تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی سراب کو دیکھ کر پانی خیال کرے۔ظاہر ہے یہ فریب نظر وقتی ہوتا ہے اور اس کو کوئی شخص بھی ذہنی قویٰ کے متاثر ہو جانے پر محمول نہیں کرتا۔

۷۴؎ خوف اس بات کا کہ یہ جادو لوگوں کو ایسا متاثر نہ کر دے کہ وہ جادو اور معجزہ میں تمیز نہ کر سکیں۔

۷۵۔ یعنی ان کے طلسم کو نگل جائے گا۔ چنانچہ موسیٰ کا سانپ جہاں بھی گیا جادو کے اثر کو زائل کرتا چلا گیا۔

۷۶۔ یعنی یہ جادوگروں کا کرتب اور فریب نظر ہے۔ ورنہ ان کی لاٹھیاں اور رسیاں واقعی سانپ نہیں بن گئی ہیں۔

۷۷۔ یعنی جادوگر جو کرتب بھی دکھائے اور فریب دہی کا جو طریقہ بھی اختیار کرے، نہ معجزۂ خداوندی کے مقابلہ میں اس کی جیت ہوسکتی ہے اور نہ حقیقی کامیابی اس کو حاصل ہوسکتی ہے۔ جادو اور معجزہ کے فرق کیلئے دیکھئے سورہ اعراف نوٹ ۱۶۹۔

۷۸۔ اس مقابلہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جادوگروں کا سارا طلسم غائب ہوگیا اور حضرت موسیٰ کی لاٹھی سانپ بن کر معجزہ دکھاتی رہی۔ اس طرح واضح ہوا کہ حضرت موسیٰ جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ جادو نہیں ہے بلکہ خدائی معجزہ ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ اس طرح جب حقیقت بے نقاب ہوکر جادوگروں کے سامنے آ گئی تو وہ بے اختیار سجدے میں گر پڑے۔

مزید تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ اعراف نوٹ ۱۷۱۔

۷۹۔ اس کی تشریح سورۂ اعراف نوٹ ۱۷۲۔ اور ۱۷۳۔ میں گزر چکی۔

❑❑❑❑❑❑

(فرعون نے) کہا تم اس پر ایمان لائے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا؟ ضرور یہ تمہارا گرو ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ تو میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تمہیں کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا۔ پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ ہم میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے۔ انہوں نے جواب دیا ہم ان روشن نشانیوں پر جو ہمارے سامنے آئی ہیں اور اس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے تجھے ہرگز ترجیح نہیں دیں گے۔ تو جو چاہے کر گزر۔ تو جو کچھ کر سکتا ہے وہ بس اس دنیوی زندگی کی حد تک ہی کر سکتا ہے۔ (القرآن)

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ۝۷۱

۷۱ (فرعون نے) کہا تم اس پر ایمان لائے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا؟ ۸۰؎ ضرور یہ تمہارا گرو ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے ۸۱؎۔ تو میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تمہیں کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا۔ پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ ہم میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے۔ ۸۲؎

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰي مَا جَاۗءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۷۲

۷۲ انہوں نے جواب دیا ہم ان روشن نشانیوں پر جو ہمارے سامنے آئی ہیں اور اس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے تجھے ہرگز ترجیح نہیں دیں گے۔ تو جو چاہے کر گزر۔ تو جو کچھ کر سکتا ہے وہ بس اس دنیوی زندگی کی حد تک ہی کر سکتا ہے۔ ۸۳؎

اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝۷۳

۷۳ ہم تو اپنے رب پر ایمان لائے تاکہ وہ ہماری خطاؤں کو بخش دے نیز جادو کے اس عمل کو بھی، جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا ۸۴؎۔ اللہ ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ ۸۵؎

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝۷۴

۷۴ یقیناً جو شخص اپنے رب کے حضور مجرم کی حیثیت سے حاضر ہوگا اس کیلئے جہنم ہے ۸۶؎، جس میں نہ مرے گا اور نہ جئے گا۔ ۸۷؎

وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ۝۷۵ۙ

۷۵ اور جو شخص مؤمن کی حیثیت سے حاضر ہوگا اور نیک عمل بھی کئے ہوں گے تو ایسے لوگوں کے لئے بلند درجے ہوں گے۔ ۸۸؎

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا مَنْ تَزَكّٰى ۝۷۶ۧ

۷۶ ہمیشگی کے باغ جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے اس کی جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ ۸۹؎

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۝۷۷

۷۷ اور ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے کر چل پڑو ۹۰؎۔ اور ان کیلئے سمندر میں خشک راہ نکال لو ۹۱؎۔ نہ تمہیں پیچھا کرنے والوں کا کوئی خوف ہوگا اور نہ (غرق ہونے کا) ڈر۔ ۹۲؎

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝۷۸

۷۸ پھر فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کیا تو سمندر نے ان کو ڈھانک لیا جس طرح ڈھانک لیا۔ ۹۳؎

وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ۝۷۹

۷۹ اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا۔ صحیح راہ نہ دکھائی۔ ۹۴؎

۸۰؎ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فرعون کا دعوئے ربوبیت محض سیاسی حاکمیت کا نہ تھا بلکہ مطلق حاکمیت کا تھا۔ چنانچہ وہ خالص دینی امور میں بھی مداخلت کرتا تھا۔ اس کی حکومت میں نہ دین حق کا پرچار کرنے کی آزادی تھی، اور نہ کسی دینی قیادت کے لئے ابھرنے کا کوئی موقع، اور نہ ہی اس کی قوم کا کوئی فرد اپنے ضمیر کی آواز پر اللہ کے دین کو قبول کر سکتا تھا۔

۸۱؎ فرعون نے جب شکست کھائی تو اپنی شکست پر پردہ ڈالنے کے لئے حضرت موسیٰ پر، یہ الزام لگا دیا کہ وہ ان جادوگروں کے استاذ ہیں، اور سب نے مل کر یہ سازش کی تھی۔

۸۲؎ یعنی اس دردناک سزا کے ملنے پر تمہیں پتہ چلے گا کہ خدا کا عذاب بڑا ہے یا میرا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرعون کیسا متکبر، ظالم اور سرکش بادشاہ تھا۔

۸۳؎ یہ تھی ایمان کی طاقت جس سے سرشار ہو کر جادوگر فرعون کے آگے سپر آرا ہوئے ''کہ تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں''۔ ایمان جب دل میں اثر کر جاتا ہے تو دل و دماغ بدل جاتے ہیں اور بہت بڑا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جادوگر کیا تھے اور آناً فاناً کیا ہو گئے!

۸۴؎ معلوم ہوا کہ جادوگر حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں آنے کے لئے دل سے آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ مگر فرعون کا دباؤ ایسا رہا کہ وہ مقابلہ کے لئے آ گئے۔

۸۵؎ یعنی فرعون تو آج ہے اور کل مرا، لیکن اللہ کی ذات تو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ لہٰذا وہی اس لائق ہے کہ اس پر توکل کیا جائے اور وہی اس کا اہل ہے کہ اس سے امیدیں وابستہ کی جائیں۔

۸۶؎ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا بیان ہے جو جادوگروں کے بیان پر اضافہ ہے۔

۸۷؎ یعنی نہ تو اسے موت آئے گی کہ مصیبت کا خاتمہ کر دے، اور نہ جئے گا کہ زندگی کا لطف اٹھائے۔ دونوں کے درمیان ایک جان لیوا مصیبت میں پھنسا رہے گا۔

۸۸؎ ایمان کے ساتھ عمل صالح کی قید اس حقیقت کو واضح کرتی ہے، کہ جنت کا یہ وعدہ ان ہی لوگوں سے ہے جو ایمان لا کر اپنے کو عمل صالح سے آراستہ کریں گے۔ افسوس کی مسلمانوں نے قرآن کے اس صریح بیان کو، جس کو قرآن نے بار بار دہرایا ہے، نظر انداز کر کے ان حدیثوں کا سہارا لیا ہے، جن میں اجمالی طور پر ایمان لانے والوں کو جنت کی خوشخبری دی گئی ہے۔ مثلاً حدیث میں ارشاد ہوا ہے **من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ** ''جس نے کہا اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ جنت میں داخل ہوا''۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہے اور اس کے بعد جو چاہے کرے، جنت میں اس کے لئے جگہ ریزرو (Reserve) ہو ہی گئی۔ اگر حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی، تو یہ غلط مطلب کبھی نہ لیا جاتا۔ مگر حدیث کو قرآن سے الگ کر کے اس کے لفظی معنیٰ کا سہارا لیا گیا، تاکہ دنیا کے فائدے بھی خوب بٹوریں اور جنت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔

۸۹؎ پاکیزگی سے مراد شرک، کفر اور گناہوں سے پاکیزگی ہے۔ متن میں لفظ تَزَکّیٰ استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ پاکیزہ ہونے ہی کے نہیں بلکہ اپنے کو سنوارنے کے بھی ہیں۔ اس لئے اس کے مفہوم میں اپنی صحیح تربیت کرنا اور نیکیوں سے اپنے کو سنوارنا بھی شامل ہے۔

۹۰؎ حضرت موسیٰ کی طویل دعوتی جدوجہد اور طرح طرح کے معجزے دکھانے کا ذکر قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ اعراف آیت ۱۳۰ تا ۱۳۵۔ یہاں آخری مرحلہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ تشریح کے لئے دیکھئے سورہ یونس نوٹ ۱۳۷؎ اور ۱۳۸؎۔

۹۱؎ یعنی اپنا عصا سمندر پر مارو تو وہ پھٹ جائے گا اور تمہارے گذرنے کے لئے بالکل خشک راہ نکل آئے گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا معجزہ تھا جو عصائے موسیٰ کے ذریعہ ظہور میں آیا۔ اگر بالفرض اتفاقی طور پر سمندر کا پانی ایک طرف ہوا ہوتا۔ یا دو حصوں میں بٹ گیا ہوتا تو جو راستہ نکل آتا وہ خشک نہیں ہو سکتا تھا۔ خشک راستہ کا سمندر کے بیچ سے یکایک نکل آنا معجزانہ طور پر ہی ممکن ہے۔ اس لئے سیدھی بات یہی ہے کہ اسے اللہ کا معجزہ تسلیم کیا جائے۔ اور آیت کی الٹی سیدھی تاویل نہ کی جائے۔ سورۂ شعراء آیت ۶۳ میں یہ واقعہ مزید صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

۹۲۔ یعنی فرعون تمہارا پیچھا تو کرے گا لیکن تم کو پکڑ نہ سکے گا۔ اس لئے تم بلا خوف چلے جاؤ۔ تمہارے سمندر میں غرق ہونے کا بھی کوئی خطرہ نہیں ہے، کیوں کہ سمندر میں سے تمہارے لئے معجزانہ طور پر راہ نکالی جائے گی۔

۹۳۔ فرعون بنی اسرائیل کا پیچھا کرتا ہوا جب سمندر کے پاس پہنچا، تو راستہ کھلا پا کر وہ بھی اپنے لشکر کے ساتھ اس پر چل پڑا۔ جب بیچ سمندر کے پہنچ گیا تو دونوں طرف سے پانی آ کر مل گیا۔ اب وہ پوری طرح سمندر کی زبردست موجوں کی لپیٹ میں تھا۔

اللہ کی یہ بہت بڑی نشانی تھی جو ظاہر ہوئی۔ بنی اسرائیل کو تو سمندر نے صحیح سلامت گزار دیا لیکن فرعونیوں کو بری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

۹۴۔ یعنی فرعون کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوا کہ وہ لوگوں کو صحیح راہ بتا رہا ہے۔ اگر وہ صحیح راہ بتاتا تو اس کا اپنی قوم سمیت یہ حشر نہیں ہوتا۔ اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے عبرت ہے جو اللہ کی ہدایت کو جسے کو وہ اپنے رسول کے ذریعہ بھیجتا ہے قبول نہیں کرتے۔ بادشاہ اور لیڈر خود گمراہ ہوتے ہیں اور عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔ انجام یہ کہ خود بھی ڈوبتے ہیں اور عوام کو لے کر ڈوبتے ہیں۔

❑❑❑❑❑❑

اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی اور طور کی دہنی جانب تم سے وعدہ کیا۔ اور تم پر من وسلویٰ اتارا۔ کھاؤ ہماری بخشی ہوئی پاک چیزیں اور اس معاملہ میں سرکشی نہ کرو ورنہ میرا غضب تم پر نازل ہوگا۔ اور جس پر میرا غضب نازل ہوا وہ ہلاکت میں گرا۔ اور میں بڑا بخشنے والا ہوں اس کے لئے جو توبہ کرے، ایمان لائے، نیک عمل کرے اور راہِ ہدایت پر چلتا رہے۔ (القرآن)

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿۸۰﴾

۸۰ اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی اور طور کی دہنی جانب تم سے وعدہ کیا ۹۵؎ اور تم پر من وسلویٰ اتارا۔ ۹۶؎

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿۸۱﴾

۸۱ کھاؤ ہماری بخشی ہوئی پاک چیزیں اور اس معاملہ میں سرکشی نہ کرو ورنہ میرا غضب تم پر نازل ہوگا۔ اور جس پر میرا غضب نازل ہوا وہ ہلاکت میں گرا۔

وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾

۸۲ اور میں بڑا بخشنے والا ہوں اس کے لئے جو توبہ کرے، ایمان لائے، نیک عمل کرے اور راہِ ہدایت پر چلتا رہے۔ ۹۷؎

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾

۸۳ اور اے موسیٰ! اپنی قوم کو چھوڑ کر جلد حاضر ہونے پر تمہیں کس چیز نے ابھارا؟ ۹۸؎

قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾

۸۴ عرض کیا وہ میرے نقش قدم پر ہی ہیں اور میں نے تیرے حضور آنے میں جلدی کی تاکہ تو راضی ہو۔ ۹۹؎

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾

۸۵ فرمایا ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے اسے گمراہ کر دیا۔ ۱۰۰؎

فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿۸۶﴾

۸۶ موسیٰ سخت غصہ میں افسوس کرتا ہوا اپنی قوم کی طرف لوٹا۔ ۱۰۱؎ اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! کیا تمہارے رب نے تم سے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ ۱۰۲؎ کیا تم پر بڑی مدت گذر گئی؟ ۱۰۳؎ یا تم یہی چاہتے تھے کہ تمہارے رب کا غضب تم پر نازل ہو! اس لئے تم نے مجھ سے عہد شکنی کی۔ ۱۰۴؎

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾

۸۷ انہوں نے جواب دیا ہم نے اپنے اختیار سے آپ سے کئے ہوئے عہد کے خلاف نہیں کیا بلکہ قوم کے زیورات کے بوجھ سے ہم گرانبار ہو گئے تھے اس لئے ہم نے ان کو پھینک دیا ۱۰۵؎۔ اس طرح سامری نے (ان کو آگ میں) ڈالا۔

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۙ فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾

۸۸ اور ان کے لئے ایک بچھڑا نکال لایا۔ ایک دھڑ جس سے گائے کی سی آواز نکلتی تھی ۱۰۶؎۔ لوگ دیکھ کر کہنے لگے یہ ہے ہمارا خدا اور موسیٰ کا بھی خدا، مگر وہ بھول گیا۔ ۱۰۷؎

۹۵۔ یعنی طور سینا کے مبارک دامن میں تمہیں شریعت کی نعمت عطا کرنے کا وعدہ کیا۔

اَیۡمَن (دہنی) کی تشریح سورۂ مریم نوٹ ۷۲۔ میں گزر چکی۔

۹۶۔ من وسلویٰ کی تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ بقرہ نوٹ ۷۶۔۔

۹۷۔ یہ آیت صراحت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا وعدہ ان لوگوں سے کیا ہے، جو شرک وکفر اور معصیت سے باز آئیں، ان باتوں پر ایمان لائیں، جس کی دعوت اللہ کا رسول دیتا ہے، نیک عمل کریں اور راہِ ہدایت یعنی اللہ کے دین وشریعت پر مرتے دم تک قائم رہیں۔

۹۸۔ حضرت موسیٰ کی طور پر حاضری کے لئے جو وقت مقرر کیا گیا تھا اس سے پہلے ہی وہ حاضر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ ان سے پوچھی۔ اللہ تعالیٰ کو حقیقتِ حال کا اچھی طرح علم تھا۔ لیکن سوال اس لئے کیا تا کہ موسیٰ پر یہ واضح ہو، کہ ایک طرف ان کا ذوق وشوق ہے جو شریعت کے حصول کے لئے ان کو وقت سے پہلے ہی طور پر لے آیا ہے۔ اور دوسری طرف ان کی قوم ہے، جو احکام خداوندی سے بے پرواہ ہو کر شرک کی راہ پر چل پڑی ہے۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔

یہ سوال غالباً معیاد کے اختتام پر کیا گیا تھا جب کہ حضرت موسیٰ کو الواح عطاء ہوئیں۔ جیسا کہ بعد کی آیات سے واضح ہے جن میں بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ اپنی قوم کے بچھڑے کی پرستش میں مبتلا ہونے کی خبر پا کر غصہ کی حالت میں قوم کی طرف لوٹے تھے۔

۹۹۔ یعنی بنی اسرائیل میری پیروی کر رہے ہیں اور میں تیرے حضور وقت سے پہلے حاضر ہوا، تا کہ تیری خوشنودی حاصل ہو۔

حضرت موسیٰ کو اطمینان تھا کہ ان کی قوم ان کے نقش قدم پر چلے گی۔ اس لئے انہوں نے اللہ کے حضور حاضری کے لئے وقت سے پہلے طور پر جانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔ لیکن بعد کے حالات نے بتا دیا کہ ان کی قوم پر ان کی غیر حاضری گراں گزری۔ طور پر ان کی حاضری کے لئے اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں ایک ماہ کی معیاد مقرر کی تھی بعد میں دس دن کا اضافہ کر کے اسے چالیس دن کر دیا گیا۔ حضرت موسیٰ مقررہ وقت سے کچھ دن پہلے ہی طور پر پہنچ گئے تھے اس لئے جب ایک ماہ گزر گیا اور حضرت موسیٰ لوٹے نہیں، تو مفسدوں کو قوم میں غلط فہمیاں پیدا کرنے اور فتنہ کھڑا کرنے کا موقع مل گیا۔

۱۰۰۔ سامری ایک فتنہ پرداز منافق تھا، جو بنی اسرائیل میں گھس آیا تھا۔ جس نے حضرت موسیٰ کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر بنی اسرائیل کو بہکایا اور بچھڑے کی پوجا پر آمادہ کیا۔ رہی اس نام کی تحقیق تو اس سلسلہ میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے سامری کوئی خاص قبیلہ یا کوئی گئو پرست قوم رہی ہو، اور یہ شخص اس کا ایک فرد ہو اور اس بنا پر قرآن نے اسے ''السامری'' (The Samiri) کہا ہو۔ قرآن نے اس کے نام کی صراحت اس لئے کی تا کہ واضح ہو جائے اصل مجرم، جس نے بچھڑے کو معبود بنا کر پیش کیا تھا وہ سامری تھا۔ اور بائبل میں حضرت ہارون کو جو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے وہ سراسر غلط اور جھوٹ ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ قرآن نے جس سامری کا ذکر کیا ہے اس کا سلطنت سامریہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیوں کہ سلطنت سامریہ یہود کی سلطنت تھی جو بہت بعد میں یعنی حضرت سلیمانؑ کے بعد وجود میں آئی۔

۱۰۱۔ غصہ اس بات پر کہ قوم شرک میں مبتلا ہو گئی۔ اور افسوس اس بات کا کہ دین توحید کی جو قیمتی متاع اس نے حاصل کی تھی، اور جس کی حفاظت واقامت کے لئے وہ قربانیاں دیتے ہوئے مصر سے طور کے دامن میں پہنچے اس کو انہوں نے کھو دیا۔

۱۰۲۔ اچھے وعدے سے مراد شریعت عطا کرنے کا وعدہ ہے جس کے لئے حضرت موسیٰ طور پر گئے تھے۔

۱۰۳۔ یعنی میری غیر حاضری کسی طویل مدت کے لئے نہیں ہوئی تھی۔ اگر ایک ماہ کی مقررہ مدت پر کچھ مزید اضافہ ہو گیا تھا تو بہر حال یہ مدت ایسی نہیں تھی، کہ تم اسے طویل غیر حاضری محسوس کرتے اور کسی فتنہ کا شکار ہو جاتے۔

۱۰۴۔ یعنی میری اتباع کا جو عہد تم نے کیا تھا اس سے پھر گئے۔

۱۰۵۔ یہ بنی اسرائیل کے ان سرداروں کا بیان ہے جن کو انہوں نے اپنے زیورات امانۃً سپرد کئے تھے۔ یہ زیورات بنی اسرائیل ہی کے تھے جن کو وہ اپنے ساتھ مصر سے لائے تھے۔ مگر صحرا کی زندگی میں ان کی عورتوں کے لئے استعمال کا نہ کوئی موقع تھا اور نہ ان کی حفاظت آسان تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنے زیورات چند معتمد اشخاص کے حوالہ کئے تھے تا کہ وہ اس کو حفاظت سے رکھیں۔ مگر یہ ذمہ داری ایسی تھی کہ وہ اس کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے۔ کیوں کہ ان کے لئے بھی صحرا میں اس کی حفاظت کرنا آسان نہ تھا۔ ادھر سامری نے قوم کو گئوسالہ پرستی میں مبتلا کرنے کیلئے ایک چال چلی۔ اس نے کچھ اس انداز میں لوگوں کو ورغلایا کہ موسیٰ نے تم کو لا کر صحرا میں چھوڑ دیا اور خود غائب ہو گئے۔ اب اگر تم کو اپنے سچے رب کی تلاش ہے تو اپنے زیورات چندے میں دیدو، میں تمہیں عجیب وغریب کرامت دکھاتا ہوں۔ لوگ اس کے ورغلانے میں آ گئے اور اپنے ان سرداروں سے، جن کو انہوں نے اپنے زیورات کا امین بنایا تھا۔ یہ مطالبہ کیا کہ وہ ان کے زیورات سامری کو چندہ میں دیدیں۔ سردار چونکہ ان زیورات کی حفاظت کی ذمہ داری کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس بوجھ کو اتار پھینک دیا۔ سامری نے ان تمام زیورات کو جمع کر کے آگ میں ڈالا اور بچھڑا ڈھال کر نکال لیا۔

واضح رہے کہ بائبل کا یہ بیان صحیح نہیں کہ بنی اسرائیل جب مصر سے چلے ہیں، تو انہوں نے مصریوں سے زیور عاریۃً (عارضی استعمال کے لئے مانگ) لئے تھے۔ اور ان کو لے کر مصر سے روانہ ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے مصریوں کو لوٹ لیا تھا۔ (ملاحظہ ہو خروج ۱۲: ۳۵، ۳۶)

بائبل کے اس بیان پر اعتماد کرتے ہوئے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہی زیور تھے، جن کو بنی اسرائیل نے پھینک دیا تھا اور سامری نے ان کو لے کر بچھڑا بنالیا تھا۔ مگر قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ کیوں کہ سورۂ اعراف میں زیورات کی نسبت موسیٰ کی قوم کی طرف کی گئی ہے:

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلاً۔ (اعراف۔ ۱۴۸)

''اور موسیٰ کے (طور پر) چلے جانے کے بعد اس کی قوم نے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا ڈھال لیا۔''

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ موسیٰ کی قوم کے اپنے زیور تھے۔ اور مصریوں کو لوٹنے کی بات تو اخلاقی پہلو سے بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ پھر حضرت موسیٰ نے کس طرح اس کی اجازت دی ہوگی، اور مصری اتنے بھولے نہیں تھے کہ اپنے زیور نکال نکال کر بنی اسرائیل کو جن کو انہوں نے اپنے ظلم کا نشانہ بنایا تھا، پیش کر دیتے۔

۱۰۶۔ یعنی سامری نے زیورات کو جو سونے کے رہے ہوں گے پگھلا کر بچھڑے کی شکل میں ڈھال لیا۔ اور اپنی فنی مہارت کا ایسا ثبوت دیا کہ ہوا کے داخل ہونے سے گائے کی سی آواز نکلنے لگی۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ ایک جسد یعنی دھڑ ہی دھڑ تھا۔ اس میں جان نہیں تھی البتہ اس میں سے محض بھاں بھاں کی آواز اس میں سے نکلتی تھی۔

۱۰۷۔ لوگ اس سنہرے بچھڑے پر ایسے ریجھ گئے کہ اس کو معبود بنا بیٹھے۔ اور یہ دعویٰ بھی کر دیا کہ موسیٰ کا خدا یہی ہے، مگر وہ بھول کر کسی اور خدا کی تلاش میں طور پر گئے ہیں۔

کیا یہ لوگ دیکھ نہیں رہے تھے کہ نہ وہ ان کی بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ نفع ونقصان پہنچا سکتا ہے۔ اور ہارون نے ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ لوگو تم اس کے ذریعہ فتنہ میں ڈال دئے گئے ہو۔ تمہارا رب تو رحمٰن ہے۔ تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔ انہوں نے جواب دیا ہم اس کی پرستش پر جمے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ واپس نہ آجائیں۔ موسیٰ نے پوچھا ہارون! تم نے جب دیکھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو تمہیں کس چیز نے روکا۔ (القرآن)

اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ
لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾

۸۹ کیا یہ لوگ دیکھ نہیں رہے تھے کہ نہ وہ ان کی بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ نفع ونقصان پہنچا سکتا ہے۔ ۱۰۸؎

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ
رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾

۹۰ اور ہارون نے ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ لوگو تم اس کے ذریعہ فتنہ میں ڈال دئے گئے ہو۔ تمہارا رب تو رحمٰن ہے۔ تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔ ۱۰۹؎

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿۹۱﴾

۹۱ انہوں نے جواب دیا ہم اس کی پرستش پر جمے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ واپس نہ آجائیں۔ ۱۱۰؎

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۙ ﴿۹۲﴾

۹۲ موسیٰ نے پوچھا ہارون! تم نے جب دیکھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو تمہیں کس چیز نے روکا۔

اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾

۹۳ کہ تم میری ہدایت پر عمل نہ کرو۔ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی؟ ۱۱۱؎

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ
تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾

۹۴ اس نے کہا اے میری ماں کے بیٹے! میری داڑھی نہ پکڑیئے اور نہ میرا سر۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ آپ کہیں گے تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میرے حکم کا انتظار نہ کیا۔ ۱۱۲؎

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾

۹۵ موسیٰ نے پوچھا سامری! تیرا کیا معاملہ ہے؟ ۱۱۳؎

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً
مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾

۹۶ اس نے جواب دیا مجھے وہ بات سجھائی دی جو دوسروں کو سجھائی نہیں دی۔ پس میں نے رسول کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی لے لی پھر اس کو چھوڑ دیا۔ میرے نفس نے مجھے ایسا ہی سمجھایا۔ ۱۱۴؎

قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۚ
وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ
عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾

۹۷ موسیٰ نے کہا جا۔ اب زندگی بھر تجھے یہ کہتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھونا ۱۱۵؎۔ اور تیرے لئے ایک اور وقت مقرر ہے جو تجھ سے ہرگز نہ ٹلے گا ۱۱۶؎۔ اور دیکھ اپنے اس خدا کو جس کی پرستش پر تو جما رہا۔ ہم اسے جلا ڈالیں گے پھر اس کو ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہا دیں گے۔ ۱۱۷؎

اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

۹۸ تمہارا خدا صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ ۱۱۸؎

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ
مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾

۹۹ اس طرح ہم تمہیں گزرے ہوئے واقعات سناتے ہیں اور ہم نے تمہیں خاص اپنے پاس سے ذکر (قرآن) عطاء کیا ہے۔ ۱۱۹؎

۱۰۸؎ یعنی عقل کے ان اندھوں کو یہ بات بھی دکھائی نہیں دی کہ یہ بچھڑا ایک ہی طرح کی آواز نکالتا ہے۔ اس سے آگے وہ ان کی کسی بات کا بھی جواب نہیں دیتا، اور نہ اس میں یہ قدرت ہے کہ کسی کو نفع یا نقصان پہنچائے۔ پھر اس میں خدائی کی صفت کہاں سے آ گئی؟ حقیقت یہ ہے کہ گئو سالہ پرستوں کا خدا محض بھاں بھاں کرتا ہے۔ مگر توحید پر ایمان رکھنے والوں کا خدا سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔ دعائیں قبول کرتا ہے اور حاجتیں پوری کرتا ہے اور ان کی صحیح رہنمائی بھی کرتا ہے۔

۱۰۹؎ حضرت ہارون نبی تھے وہ اس فتنہ کو دیکھ کر کس طرح خاموش رہ سکتے تھے۔ انہوں نے قوم کو متنبہ کیا کہ دیکھو اس بچھڑے کا وجود سراسر فتنہ ہے، تم اس آزمائش میں ڈال دئے گئے ہو، کہ اپنے ایمان پر مضبوطی سے قائم رہتے ہو یا کفر و شرک کی روش اختیار کرتے ہو۔ تمہارے لئے بچھڑے کی پوجا کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے جب کہ تمہارا رب کائنات کی وہ عظیم ہستی ہے، جس کو تم رحمٰن (مہربان خدا) کے نام سے جانتے ہو۔ میں اس کا رسول ہوں لہٰذا میری پیروی کرو اور جو حکم میں دے رہا ہوں اس کو مانو۔

۱۱۰؎ یہ تھی بنی اسرائیل کی جسارت کہ ایک نبی کی بروقت تنبیہ کو بھی خاطر میں نہیں لایا۔ اور انہیں ایسا جواب دیا جس کے ایک ایک لفظ سے سرکشی کا اظہار ہوتا ہے۔

۱۱۱؎ حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون سے بھی سخت باز پُرس کی کہ جب لوگ گمراہ ہو رہے تھے، تو کیا وجہ تھی کہ تم نے فتنہ کو مٹانے کے لئے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا یعنی ایسے لوگوں کے خلاف اقدام نہیں کیا۔ حضرت موسیٰ جب طور پر جا رہے تھے تو انہوں نے حضرت ہارون کو یہ ہدایت کی تھی کہ وَ اَصۡلِحۡ (اعراف: ۱۴۲) ''اصلاح کے کام کرنا'' جس میں برائی کو دور کرنا بھی شامل تھا۔

۱۱۲؎ حضرت ہارون نے بڑے تحمل سے کام لیا اور حضرت موسیٰ پر حقیقت حال واضح کر دی۔ انہوں نے دیکھا کہ بنی اسرائیل کی ایک اچھی خاصی تعداد پر سامری کا جادو چل گیا ہے۔ اور بچھڑے کی محبت کا نشہ ان پر کچھ ایسا چڑھ گیا ہے کہ اس کی پرستش سے ان کو روکنا قوت کے استعمال کے بغیر ممکن نہیں۔ اور قوت کے استعمال کے لئے بنی اسرائیل کے جو لوگ آگے بڑھیں گے، ان پر بچھڑے کے یہ پرستار تلوار اٹھائیں گے۔ اس طرح بنی اسرائیل کی جمعیت پھوٹ کا شکار ہو جائے گی۔ اور وہ ایک نبی (حضرت ہارون) کو قتل کرنے میں بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اور اگر ایسا ہوا تو بنی اسرائیل ایک زبردست حادثہ سے دوچار ہو جائیں گے۔ جب حضرت موسیٰ کی واپسی چند دنوں ہی میں متوقع ہے تو مناسب یہی ہے کہ ان کے آنے کا انتظار کیا جائے۔ یہ حضرت ہارون کی دور اندیشی تھی جس کی بنا پر انہوں نے معاملہ کو چند روز کے لئے ملتوی کر دیا۔ اس میں مداہنت یا پست حوصلگی کی کوئی بات نہ تھی اور نہ ایک نبی کے بارے میں اس قسم کی بدگمانی کی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود حضرت موسیٰ کا سختی کے ساتھ باز پرس کرنا برمحل ہی تھا۔ کیوں کہ ان کا جوش غضب غیرتِ ایمانی کی بنا پر تھا۔ ایسے موقع پر ظاہری آداب کو ملحوظ رکھنے میں جو کوتاہی ہوتی ہے وہ قابل درگذر ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی نہ اس بات پر گرفت فرمائی کہ انہوں نے ہارون کی داڑھی کیوں پکڑی؟ اور نہ اس بات پر فرمائی کہ تختیاں جن پر تورات لکھی ہوئی تھی کیوں نیچے ڈال دیں؟ واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے جوشِ غضب نے پوری قوم کو مرعوب کر دیا۔ شر پسندوں نے جب دیکھا کہ وہ ایک نبی کے ساتھ بھی سخت گیری کر رہے ہیں تو ان کی ہمت نہیں ہوئی کہ سامری کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔ اس طرح حضرت موسیٰ کے جلال نے قوم کو اپنے قابو میں کر لیا اور بچھڑے کے پرستاروں پر یہ برق بن کر گرا۔ چنانچہ اس روز جیسا کہ بائبل کا بیان ہے تین ہزار آدمی قتل کر دئے گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ یہ ان کے مرتد ہونے (دین توحید سے پھر جانے) کی سزا تھی۔ اس موقع پر سورۂ بقرہ نوٹ ۷۳؎ اور سورۂ اعراف نوٹ ۲۲۰؎ تا ۲۲۶؎ بھی پیش نظر رہیں۔

۱۱۳؎ قوم کو اپنے قابو میں کرنے کے بعد حضرت موسیٰ نے فتنہ کے اصل سرغنہ سامری کو طلب کیا اور اس سے پوچھا کہ تو نے یہ کیا کیا؟

۱۱۴؎ سامری نے جو حرکت کی تھی اس کو جائز (Justify) قرار دینے کیلئے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی، چونکہ وہ منافق تھا اسلئے کھل کر اپنے گناہ کا اعتراف بھی نہ کر سکا۔ البتہ دبے لفظوں میں اس نے اپنی شکست خوردہ ذہنیت کا اظہار کیا۔ اس نے تین باتیں کہیں ایک یہ کہ مجھے وہ بات سجھائی دی، جو دوسروں کو سجھائی نہیں دی۔ یعنی زیورات کو جمع کر کے سنہرا بچھڑا ڈھالنے کی تجویز میرے ذہن میں آئی کسی اور کے ذہن میں نہیں آئی۔ ایسا کیوں ہوا اس کی کوئی توجیہ میں نہیں کر سکتا۔

دوسری بات اس نے یہ کہی کہ یہ تجویز چونکہ میرے ذہن میں گھوم رہی تھی اس لئے میں نے رسول کی پیروی میں بہت تھوڑا حصہ لیا۔ اور جس قدر حصہ لیا اسے بھی بعد میں ترک کر دیا۔ اور تیسری بات اس نے یہ کہی کہ اس طرح میرے نفس نے میری نظر میں اس کام کو خوشنما بنا دیا۔ غرضیکہ سامری نے سیدھے طریقہ سے نہ اپنے جرم کا اعتراف کیا اور نہ توبہ کی۔ بلکہ یہ دیکھ کر کہ وہ حضرت موسیٰ کی گرفت میں بری طرح آچکا ہے گول مول الفاظ میں اس بات کا اعتراف کیا کہ یہ میری ذہنی اپج تھی اور کیا کروں میرے نفس نے مجھے ایسا ہی سمجھایا۔

واضح رہے کہ مفسرین کے ایک گروہ نے اس آیت کے کچھ اور ہی معنیٰ بیان کئے ہیں۔ ان کے نزدیک فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِنْ اَثَرِ الرَّسولِ فَنَبَذْتُهَا کے معنیٰ ہیں: ''میں نے رسول کے نقش قدم سے ایک مٹھی خاک اٹھالی اور بچھڑے کے اندر ڈال دی۔'' اس کا مفہوم وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ سامری نے جبریل کے گھوڑے کو دیکھا تھا اور اس کے پاؤں کے نیچے سے مٹھی بھر خاک اٹھائی تھی۔ اس خاک میں زندگی پیدا کرنے کی خصوصیت تھی اس لئے جب اس نے بچھڑے کو ڈھالتے ہوئے یہ خاک اندر ڈالی تو اس بچھڑے میں زندگی پیدا ہوگئی۔ مگر آیت کی یہ تفسیر نہ قرآن سے مطابقت رکھتی ہے اور نہ حدیث ہی سے یہ ثابت ہے۔ پھر مفسرین کو کس طرح معلوم ہوا کہ سامری نے جبریل کو دیکھ لیا تھا اور یہ کہ وہ گھوڑے پر سوار تھے اور اس کے ٹاپ کی مٹی حیات بخش تھی، اور یہ اس مٹی ہی کی کرامت تھی کہ اس نے بچھڑے میں جان ڈال دی؟ یہ سراسر ایک من گھڑت قصہ ہے جس کو غلطی سے مفسرین نے قبول کر لیا۔ آیت کی یہ تاویل متعدد وجوہ سے غلط ہے:

(۱) بَصُرت کا تعلق یہاں آنکھ سے نہیں بلکہ ذہن سے ہے۔ اسی لئے ہم نے اس کا ترجمہ ''مجھے سجھائی دیا سے کیا ہے۔ عربی کی مشہور اور مستند لغت صحاح جوہری میں ہے: وَبَصُرْتُ بِالشَّیْءِ: عَلِمْتُهٗ ''بَصُرت بِالشَّیْءِ کے معنیٰ ہیں میں نے اس کو جان لیا۔'' (ج ۲ ص ۵۹۱)

اگر جبریل کو دیکھنا مراد ہوتا تو اس کے لئے رَأَیتُ، نَظَرْتُ، اَبْصَرْتُ جیسا کوئی لفظ استعمال ہوتا نہ کہ بَصُرْتُ۔۔۔۔۔ جو کم ہی اس معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ تو تھی لغت کے لحاظ سے صحیح معنیٰ کی تعیین۔ اب ذرا اس بات پر بھی غور کیجئے کہ حضرت جبریل کو دیکھنے کی سعادت سامری جیسے منافق اور مفسد کو کیوں حاصل ہونے لگی؟ جبریل کے گھوڑے پر سوار ہونے کا ثبوت کیا ہے؟ اور سامری کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ ان کے گھوڑے کے پاؤں کے نشان کی مٹی ایسی بابرکت ہے کہ کسی چیز میں ڈالتے ہی اس میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اگر اسے وہ حیات بخش سمجھتا تھا تو پھر وہ کسی مردہ انسان کو اس کے ذریعہ زندہ بھی کر سکتا تھا یا خود مٹی کھا کر ہمیشہ کیلئے زندہ رہ سکتا تھا۔ پھر اس نے ایسا کیوں نہیں کیا! قرآن میں تو جبریل کے خاکِ پا کی یہ تاثیر کہیں بھی بیان نہیں ہوئی ہے۔ اور نہ بچھڑے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس میں جان پڑ گئی تھی، بلکہ قرآن صاف کہتا ہے کہ وہ محض ایک دھڑ (جسد) تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قصہ بالکل بیہودہ ہے۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں قوی دلائل سے اس کی تردید کی ہے۔ لیکن جو لوگ بدعتوں کی تائید میں اونٹ پٹانگ باتیں کرتے رہتے ہیں انہیں یہ مصرع لگانے کا موقع مل گیا کہ :

''جب حضرت جبریل کی گھوڑے کے خاک بے جان سونے میں جان پیدا کر سکتی ہے تو بزرگوں کے قدموں کی خاک مردہ دلوں کو ضرور زندہ کر دیتی ہے۔''
(تفسیر نور العرفان ص ۵۰۸)

(۲) آیت میں الرسول کا لفظ استعمال ہوا ہے اور موقع کلام کے لحاظ سے اس سے مراد موسیٰ ہی ہو سکتے ہیں کیوں کہ مسئلہ ان ہی کی پیروی کا تھا۔ جبریل کا ذکر اس سلسلہ کی آیات میں کہیں بھی نہیں ہوا ہے پھر ان کو کس طرح مراد لیا جا سکتا ہے؟ رہا یہ سوال کہ پھر سامری نے حضرت موسیٰ کو جواب دیتے ہوئے ''آپ کی پیروی کے بجائے رسول کی پیروی'' کے الفاظ کیوں استعمال کئے تو اس کی وجہ دراصل اس کا گول مول انداز بیان تھا۔

(۳) رسول کے نقش قدم سے ایک مٹھی لینے کے معنیٰ مٹھی بھر مٹی لینے کے نہیں ہیں۔ بلکہ موقع کلام دلیل ہے کہ اس کے معنیٰ رسول کی قدرے اتباع کرنے یا اس کی پیروی میں تھوڑا سا حصہ لینے کے ہیں۔ اسی طرح نَبَذْتُهَا کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ میں نے اس مشتِ خاک کو بچھڑے کے اندر ڈال دیا۔ کیوں کہ نَبَذَ کے معنیٰ عربی میں پھینک دینے یا بے وقعتی کے ساتھ کسی چیز کو ڈال دینے کے آتے ہیں:

النَّبْذُ اَلْقَاءُ الشَّیْءِ وَطَرْحُہٗ لِقِلَّۃِ الْاِعْتِدَادِ بِہٖ وَلِذٰلِکَ یُقَالُ نَبَذْتُہٗ نَبْذَ النَّعْلِ الْخَلَقِ۔ (المفردات۔راغب ص ۴۹۸)

''نَبْذَ کے معنیٰ کسی چیز کو اس کے بے وقعت ہونے کی بنا پر ڈال دینے اور پھینک دینے کے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے میں نے اس کو اس طرح پھینکا جس طرح پرانی جوتیوں کو پھینکا جاتا ہے۔''

اگر سامری نقش پائے رسول کی خاک کو بابرکت اور حیات بخش سمجھتا تھا، تو بچھڑے کے اندر ڈالنے کے لئے وہ ایک ایسا لفظ کیسے استعمال کرتا، جس سے اس مٹی کا بے وقعت ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اس کے لئے القاء (ڈالنے) کا لفظ استعمال کرتا یعنی کہتا فَاَلْقَیْتُھَا (میں نے اس مشتِ خاک کو ڈال دیا)۔ لہٰذا لغوی طور پر نَبذَ کا لفظ رسول کی پیروی ترک کرنے اور اس کی اتباع کو بے وقعت خیال کر کے چھوڑ دینے کے معنیٰ میں موزوں ہو رہا ہے۔ قرآن کریم میں بھی یہ لفظ اِسی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے:

نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ کَاَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ط (بقرہ۔۱۰۱)

''اہل کتاب کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اس طرح پس پشت ڈال دیا کہ گویا وہ جانتے ہی نہیں۔'' ظاہر ہے یہاں نَبَذَ (ڈال دیا) کے معنی کتابُ اللہ کو بے التفاتی کے ساتھ پیٹھ پیچھے ڈال دینے کے ہیں۔

۱۱۵۔ الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ اللہ کا عذاب تھا جو اس کے لئے مقدر ہوا اور جس کا اعلان حضرت موسیٰ نے کیا۔ اسے معاشرہ سے کاٹ دیا گیا اور ایسی حالت میں اسے تنہا چھوڑ دیا گیا کہ کوئی شخص اس کے پاس پھٹکنے نہ پائے۔ وہ شرک کی نجاست سے آلودہ ہو گیا تھا اس لئے سزا کے طور پر اس کو ہمہ تن نجس قرار دیا گیا کہ کوئی شخص اس کو چھونے نہ پائے۔ ذلت کی انتہا یہ کہ وہ خود اپنی زبانی اپنے اچھوت ہونے کا اعلان کرتا رہے۔ اغلب یہ ہے کہ وہ کسی موذی اور خطرناک مرض میں مبتلا کر دیا گیا ہوگا۔

جن لوگوں نے بچھڑے کو پوجا تھا، ان کو قتل کر دیا گیا۔ (سورہ بقرہ آیت ۵۴ اور نوٹ ۷۳) لیکن سامری کو عذاب بھگتنے کے لئے زندہ چھوڑ دیا گیا تا کہ وہ نشان عبرت بنا رہے۔

۱۱۶۔ مراد وہ سزا ہے جو قیامت کے دن ملے گی۔

۱۱۷۔ بچھڑا زیورات سے بنایا گیا تھا جو سونے چاندی کے رہے ہوں گے۔ حضرت موسیٰ نے اسے جلا کر ریزہ ریزہ کر دیا، یعنی اس کا سفوف بنا ڈالا اور اس سفوف کو دریا میں بہا دیا۔ اس طرح حضرت موسیٰ نے بت شکنی کی ابراہیمی سنت کو زندہ کر دیا۔ اور دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ اگر بچھڑا خدا ہوتا تو وہ راکھ کا ڈھیر نہ بن جاتا اور اس کا پجاری مردود ہو کر نہ رہ جاتا۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ بچھڑا ایک بے جان دھڑ تھا۔ اگر اس میں جان ہوتی اور وہ گوشت پوست کا بچھڑا ہوتا، تو اسے ذبح کر دیا جاتا اور پھر نذر آتش کیا جاتا۔

ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ منکر کو مٹانے اور اس سے شدید نفرت پیدا کرنے کے لئے سونے چاندی کی قیمتی چیزوں کو بھی ضائع کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ غیرتِ ایمانی کے مقابلہ میں ضیاعِ مال ایک بے معنیٰ بات ہے۔

۱۱۸۔ یہ توحید کی ایک اور دلیل ہے۔ خدا وہی ہو سکتا ہے جس کا علم کلی اور ہمہ گیر ہو۔ یہ صفت صرف اللہ ہی کی ہے اس لئے خدا صرف وہی ہے۔ مگر جو لوگ شرک اور بت پرستی میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے نزدیک ایک بیل بھی خدا ہو سکتا ہے اور ایک بدھو بھی!

۱۱۹۔ ذکر سے مراد قرآن ہے۔ قرآن کو ذکر سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ خدا کو یاد دلانے والی کتاب ہے۔ بندہ اسے جہاں سے بھی پڑھے خدا کی یاد میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ ان باتوں کی بھی یاد دہانی کراتا ہے جن سے انسانی فطرت پہلے ہی سے آشنا ہے، نیز اس لئے بھی کہ وہ سرتاسر نصیحت ہے۔

مَّنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾

۱۰۰ جو لوگ اس سے رخ پھیریں گے وہ قیامت کے دن بھاری بوجھ اٹھائیں گے۔ ۱۲۰؎

خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ۙ

۱۰۱ وہ اسی حالت میں ہمیشہ رہیں گے ۱۲۱؎۔ اور یہ بہت بُرا بوجھ ہوگا جس کو قیامت کے دن وہ اپنے اوپر لادے ہوں گے۔

يَّوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾ۚ

۱۰۲ وہ دن کہ صور پھونکا جائے گا ۱۲۲؎۔ اور ہم مجرموں کو اس دن اس حال میں جمع کرینگے کہ ان کی آنکھیں نیلی پڑی ہوں گی۔ ۱۲۳؎

يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾

۱۰۳ وہ آپس میں ایک دوسرے سے چپکے چپکے کہتے ہوں گے کہ تم تو صرف دس دن رہے ہوگے۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾

۱۰۴ ہم خوب جانتے ہیں وہ جو کچھ کہیں گے۔ اس وقت ان میں جو سب سے بہتر اندازہ لگانے والا ہوگا کہے گا کہ تم بس ایک دن رہے ہو گے۔ ۱۲۴؎

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّىْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ۙ

۱۰۵ اور یہ لوگ تم سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہو میرا رب ان کو گرد، بنا کر اڑا دے گا۔ ۱۲۵؎

فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ۙ

۱۰۶ اور زمین کو اس حال میں چھوڑے گا کہ وہ صاف اور ہموار میدان ہوگا۔

لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾

۱۰۷ اس میں نہ تم کجی دیکھو گے اور نہ بلندی۔ ۱۲۶؎

يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِىَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾

۱۰۸ اس دن لوگ ایک پکارنے والے کے پیچھے چلیں گے۔ اس سے ذرا انحراف نہ کرسکیں گے ۱۲۷؎، اور ساری آوازیں رحمٰن کے آگے پست ہوجائیں گی۔ ایک آہٹ کے سوا تم کچھ نہ سنو گے۔ ۱۲۸؎

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِىَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾

۱۰۹ اس روز شفاعت کام نہ دے گی مگر اس کی جس کو رحمٰن اجازت دے اور اس کی بات پسند فرمائے۔ ۱۲۹؎

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾

۱۱۰ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ ۱۳۰؎

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَىِّ الْقَيُّوْمِ ؕ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾

۱۱۱ تمام چہرے اس حیّ و قیوم کے آگے جھکے ہونگے۔ اور نامراد ہوگا وہ جو ظلم کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوگا۔ ۱۳۱؎

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

۱۱۲ اور جس نے نیک کام کئے ہوں گے اور وہ مؤمن بھی ہوگا تو اس کے لئے نہ کسی ظلم کا اندیشہ ہوگا اور نہ حق تلفی کا۔

۱۲۰؎ قرآن کو ''ایک مذہبی کتاب'' سمجھ کر نظر انداز کرنا وہ زبردست غلطی ہے جس میں دنیا کی قومیں مبتلا ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن فرمان الٰہی ہے۔ کسی قوم، ملک اور زمانہ کی تخصیص کے بغیر پوری انسانیت کیلئے اور ہر دور کیلئے نازل ہوا ہے، جس کا مخاطب ہر ہر فرد ہے۔ لہٰذا جس شخص تک بھی قرآن یا اس کی دعوت پہنچ جائے اور وہ اس سے منہ موڑے، وہ اپنے کو معصیت کی راہ پر ڈال دیتا ہے، کیوں کہ فرمان الٰہی کو رد کرنے کا مطلب باغیانہ طرز عمل اختیار کرنا ہے۔ اور باغیانہ طرز عمل اختیار کر کے آدمی بہت بڑے گناہ کا بوجھ اپنے سر لے لیتا ہے۔ مگر اس کا احساس اسے قیامت کے دن ہوگا کہ وہ کتنا بڑا بوجھ اپنے سر پر لادے ہوئے ہے۔

۱۲۱؎ یعنی ہمیشہ گناہوں کے بوجھ تلے دبے رہیں گے اور اس کی سزا بھگتیں گے۔ کیوں کہ کفر اور شرک کا گناہ ایسا ہے جو چپک کر رہ جاتا ہے اور کبھی جدا نہیں ہوتا۔

۱۲۲؎ یہ قیامت کا سائرن (Siron) ہوگا جس کی آواز زمین کے گوشہ گوشہ تک پہنچ جائے گی۔ جب پہلا سائرن ہوگا تو زمین کی ساری مخلوق مر جائے گی اور نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ جب دوسرا سائرن ہوگا تو تمام انسان جو آدم سے لے کر قیامت تک پیدا ہوتے رہے ہیں جسم سمیت دوبارہ زندہ ہو کر زمین سے نکل پڑیں گے۔

۱۲۳؎ یعنی دہشت کی وجہ سے مجرموں کی آنکھوں کا رنگ نیلا پڑا ہوگا، بالفاظ دیگر ان کی آنکھیں بے رونق ہوگئی ہوں گی۔

۱۲۴؎ مرنے کے بعد انسان کی روح قیامت تک عالم برزخ میں رہتی ہے، جو دنیا اور آخرت کے درمیان کا عالم ہے۔ اس عالم میں انسان نے خواہ کتنی ہی لمبی مدت گزاری ہو قیامت کے دن اسے ایسا محسوس ہوگا کہ یہ واقعہ بس چند دن کا تھا۔ اور منکرین میں سے جو شخص سب سے بہتر اندازہ لگانے والا ہوگا وہ کہے گا کہ نہیں وقفہ صرف ایک دن کا رہا ہے۔

وقت کی طوالت کو محسوس نہ کرنے کا تجربہ ہمیں دنیا کی زندگی میں بھی ہوتا رہتا ہے۔ کئی گھنٹے سوتے رہنے کے بعد جب ہم بیدار ہوتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم ابھی سوئے تھے اور ابھی اٹھ گئے۔ جب وقت کے بارے میں ہمارے احساسات کا حال یہ ہے تو قیامت کو دور خیال کر کے دنیا کے عیش میں مست رہنا نادانی، اور فریب نفس نہیں تو اور کیا ہے؟

۱۲۵؎ تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ کہف نوٹ ۶۶؎ اور سورۂ قارعہ نوٹ ۵؎۔

۱۲۶؎ یعنی زمین کی ہیئت بالکل بدل جائے گی۔ نہ کہیں ٹیڑھ میڑھ ہوگا اور نہ کہیں نشیب و فراز۔ انسان کی بنائی ہوئی عمارتیں تو پہلے ہی مسمار ہو چکی ہوں گی۔ پہاڑ ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں اڑا دئے گئے ہوں گے۔ درخت، جھاڑ جھنکار اور جنگلوں کا صفایا کر دیا گیا ہوگا۔ جغرافیائی تبدیلی ایسی عمل میں آئے گی کہ کسی بھی ملک کا نشان باقی نہیں رہے گا۔ اس طرح زمین ایک ہموار اور چٹیل میدان کی شکل اختیار کرے گی، تا کہ لاتعداد انسان اپنے رب کے حضور حاضری کیلئے جمع ہو سکیں۔

۱۲۷؎ پکارنے والے سے مراد فرشتہ ہے۔ میدانِ حشر میں جس کے کھڑے ہونے کی جو جگہ مقرر ہوگی اس کی طرف فرشتہ اسے لے جائے گا۔ اور وہ اس فرشتہ کے پیچھے پیچھے چلا جائے گا۔ کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ اس سے انحراف کر کے کہیں اور نکل جائے۔

۱۲۸؎ قیامت کا یہ اجتماع کیا ہوگا، انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ مگر نہ ہنگامہ آرائی ہوگی اور نہ شور وغل۔ مجال نہیں کہ کوئی آواز بلند کر سکے۔ سب کی آوازیں خدائے رحمٰن کے حضور دب گئی ہوں گی۔ اس وقت صرف قدموں کی آہٹ سنائی دے گی۔

۱۲۹؎ تشریح کے لئے دیکھئے۔ سورۂ بقرہ نوٹ ۴۱۲؎ اور سورہ مریم نوٹ ۱۱۱؎

۱۳۰؎ مطلب یہ ہے کہ کون اس بات کا مستحق ہے کہ اس کے حق میں عذاب اخروی سے نجات کی سفارش کی جائے اور کون اس کا مستحق نہیں ہے۔ اس کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ کیوں کہ وہ ماضی، حال، مستقبل، حاضر، غائب سب کا جاننے والا ہے۔ اور وہ ہر ہر شخص کی نیت اور اس کے احوال سے پوری طرح باخبر ہے۔ لہٰذا سفارش کی عام اجازت کسی کو بھی نہیں دی جائے گی کہ وہ جس کے لئے چاہے سفارش کرے بلکہ یہ اجازت اس شرط کے ساتھ مشروط ہوگی کہ ان ہی کے حق میں سفارش کی جائے جن کے بارے میں سفارش سننا اللہ پسند فرمائے گا۔

۱۳۱؎ یہاں ظلم سے مراد جیسا کہ بعد کی آیت سے واضح ہے وہ رویہ ہے جو ایمان اور عمل صالح کے خلاف ہو۔ شرک، کفر اور معصیت کیش ہونا (گناہ کی زندگی گذارنا) اس میں شامل ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّ صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾

۱۱۳ اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن کی شکل میں اتارا ۱۳۲؎ اور اس میں ہم نے مختلف طریقوں سے تنبیہیں پیش کیں ۱۳۳؎، تاکہ لوگ اللہ سے ڈریں یا یہ ان کے لئے یاددہانی کا باعث ہو۔ ۱۳۴؎

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۚ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

۱۱۴ پس برتر ہے اللہ بادشاہ حقیقی ۱۳۵؎۔ اور قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کرو قبل اس کے کہ اس کی وحی تم پر پوری کر دی جائے ۱۳۶؎۔ اور دعا کرو کہ اے میرے رب! میرا علم اور زیادہ کر۔ ۱۳۷؎

وَلَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾

۱۱۵ ہم نے ۱۳۸؎، اس سے پہلے آدم کو تاکیدی حکم دیا تھا۔ ۱۳۹؎ مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔ ۱۴۰؎

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾

۱۱۶ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہیں کیا۔ اس نے انکار کیا۔ ۱۴۱؎

فَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾

۱۱۷ اس پر ہم نے کہا اے آدم یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے تو ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۙ﴿۱۱۸﴾

۱۱۸ یہاں تمہارے لئے یہ (سہولت) ہے کہ نہ بھوکے رہو اور نہ برہنہ۔

وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾

۱۱۹ نہ پیاس لگے اور نہ دھوپ۔ ۱۴۲؎

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾

۱۲۰ مگر شیطان نے اس کو ورغلایا ۱۴۳؎۔ کہا اے آدم! میں تمہیں بتاؤں ہمیشگی کا درخت اور ایسی بادشاہت جس پر کبھی زوال نہ آئے؟ ۱۴۴؎

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۚ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۖ﴿۱۲۱﴾

۱۲۱ چنانچہ دونوں (آدم اور حوا) نے اس درخت کا پھل کھا لیا۔ نتیجہ یہ کہ دونوں کے ستر اُن پر کھل گئے اور وہ جنت کے پتوں سے اپنے کو ڈھانکنے لگے ۱۴۵؎۔ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی ۱۴۶؎۔ اور وہ بے راہ ہو گیا۔ ۱۴۷؎

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾

۱۲۲ پھر اس کے رب نے اسے قبولیت سے نوازا، اس کی توبہ قبول کی اور اسے ہدایت بخشی۔ ۱۴۸؎

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾

۱۲۳ ارشاد ہوا تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو ۱۴۹؎۔ پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے ۱۵۰؎ تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ مصیبت میں پڑے گا۔ ۱۵۱؎

۱۳۲؎ اس کی تشریح سورۂ یوسف نوٹ ۳؎ میں گذر چکی۔

۱۳۳؎ تنبیہ اللہ کی جلالی صفات کو پیش کر کے، تنبیہ گزری ہوئی سرکش قوموں کے واقعات کو یاد دلا کر، تنبیہ عذاب کے اس کوڑے کے ذریعہ جو مفسد افراد اور قوموں پر دنیا میں برستا رہتا ہے، تنبیہ موت کی سختیوں کا ذکر کر کے، تنبیہ قیامت کی ہولناکیاں بیان کر کے اور تنبیہ جہنم کی وعید سنا کر۔

۱۳۴؎ یعنی قرآن کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ لوگ تقویٰ (خداخوفی اور پرہیزگاری) کی زندگی گزاریں۔ لیکن اگر لوگ اس کو قبول نہیں کرتے تو قرآن ان کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلائے تا کہ اللہ کی حجت ان پر قائم ہو جائے۔

۱۳۵؎ اللہ کے بادشاہ حقیقی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا فرمانروا اللہ اور صرف اللہ ہے۔ رہے دنیوی بادشاہ تو ان کے اختیارات اللہ ہی کے عطا کردہ ہیں۔ اس لئے وہ محض مجازی معنیٰ میں بادشاہ ہیں۔ اور وہ حق کی بنا پر (Dejure) اس بات کے مجاز نہیں ہیں کہ اللہ کے حکم کی جگہ اپنا حکم چلائیں۔

۱۳۶؎ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ جب قرآن نازل ہو رہا ہو تو اس کو پڑھنے میں جلدی نہ کرو جب تک کہ وحی پوری نہ ہو جائے۔ یعنی پہلے وحی کو پوری توجہ کے ساتھ سن لو اور جب وہ پوری ہو جائے تو اسے پڑھو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کس شوق و انہماک سے وحی کو اخذ (حاصل) کرتے تھے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ قرآن مکمل طور سے وحی الٰہی ہے۔ اس کی تصنیف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۱۳۷؎ یہاں علم سے مراد وہ علم ہے جو وحی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ علم کائنات کے اسرار و رموز اور غیبی حقیقتوں کو جاننے اور خدا کی پسند اور ناپسند کو معلوم کرنے کا صحیح ذریعہ ہے۔ اس لئے دنیا کے تمام علوم پر اس کی فوقیت ظاہر ہے۔ اس علم کی طلب، طلبِ صادق ہے اور اس میں فراوانی (ترقی) کے لئے دعا قدر شناسی کی علامت ہے۔

یہ علم قرآن کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس پر غور کرنے سے علوم و معارف کے دروازے کھلتے ہیں۔ مگر اس ٹھوس علم سے کم ہی لوگ فیضیاب ہو رہے ہیں۔ دنیا اس سے بالکل نا آشنا ہے۔

۱۳۸؎ اب حضرت آدم کی سرگزشت کے کچھ پہلو پیش کئے جا رہے ہیں۔ مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ انسان کی اصل کمزوری کیا ہے اور وہ کس طرح شیطان کے فریب میں آجاتا ہے۔

۱۳۹؎ تاکیدی حکم اس بات کا، کہ فلاں درخت کے پاس نہ جانا۔ (سورہ بقرۂ آیت ۳۵)

۱۴۰؎ یعنی آدم میں ارادہ کی پختگی نہیں تھی اس لئے اس سے یہ لغزش ہوئی کہ شیطان کے فریب میں آ گیا۔ چونکہ خدا کے تاکیدی حکم کو وہ بھول گیا اس لئے اس نے اس درخت کا پھل کھا لیا جس سے منع کیا گیا تھا۔

معلوم ہوا کہ انسان کی بنیادی کمزوری بھول اور ارادہ کا مضبوط نہ ہونا ہے۔

۱۴۱؎ اس کی تشریح سورۂ بقرہ نوٹ ۴۷؎، ۴۸؎ میں گزر چکی۔

۱۴۲؎ آدم علیہ السلام کو جس جنت میں رکھا گیا تھا، اس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہاں بھوک اور پیاس کی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کے باوجود کھانے پینے کی اشیاء وافر پیمانے پر مہیا کر دی گئی تھیں تا کہ وہ بہ فراغت کھا سکیں۔ اسی طرح لباس ایسا پہنا دیا گیا تھا کہ جسم پر قائم رہنے والا تھا۔ اس لئے انہیں برہنگی کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ سورج کی دھوپ اور گرمی سے بھی انہیں محفوظ رکھا گیا تھا۔ یہ ایک عارضی جنت تھی جس میں اس اہتمام کے ساتھ حضرت آدمؑ اور حضرت حوّا کو رکھا تھا۔ رہا یہ سوال کہ یہ جنت کہاں تھی تو قرآن نے اس کا ذکر نہیں کیا کیوں کہ پیش نظر مقصد کے لئے یہ تفصیلات غیر ضروری تھیں۔

۱۴۳؎ اس کی تفصیل سورۂ اعراف نوٹ ۲۵؎ میں کیا گیا ہے۔

۱۴۴؎ شیطان نے آدم کو ورغلانے کیلئے مختلف باتیں کہی تھیں۔ کبھی تو یہ کہا کہ اس درخت کا پھل کھانے سے تمہیں اس لئے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن

جاؤ (سورۂ اعراف آیت ۲۰) اور کبھی یہ کہا کہ اگر تم نے اسے کھالیا تو تمہیں ہمیشگی کی زندگی اور لازوال بادشاہی حاصل ہوگی۔

۱۴۵؎ تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ اعراف نوٹ ۲۶؎ ، ۲۹؎ اور ۳۰؎۔

۱۴۶؎ حضرت آدم نے نافرمانی تو کی، لیکن یہ نافرمانی قصد وارادہ کے ساتھ نہیں تھی، نہ اس میں سرکشی کا کوئی دخل تھا، بلکہ یہ محض بھول کا نتیجہ تھی۔ جس کی صراحت خود قرآن نے کی ہے۔ اس بھول پر گرفت اس لئے ہوئی کہ انہوں نے اللہ کے اس تاکیدی حکم کو یاد رکھنے کی پوری پوری کوشش نہیں کی، کہ مخصوص درخت ان کیلئے ممنوع ہے۔

رہا یہ اشکال کہ آدم نبی تھے اور نبی گناہ سے محفوظ ہوتا ہے، تو اولاً یہ بات ان کو نبوت عطا کئے جانے سے قبل کی ہے۔ ثانیاً یہ واقعہ عارضی جنت میں پیش آیا تھا جو بنائی ہی گئی تھی مخصوص قسم کی آزمائش کے لئے، ثالثاً گناہ اور گناہ میں فرق ہے۔ یہ گناہ ایک لغزش تھی جو شیطان کے فریب میں آنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔

۱۴۷؎ متن میں لفظ ''غویٰ'' استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ گمراہی کے بھی ہیں اور جہالت یا خواہشات کے غلبہ کے تحت بے راہ ہوجانے کے بھی۔ چنانچہ سورۂ قصص آیت ۱۸ میں ایک جھگڑالو شخص کے بارے میں حضرت موسیٰ کا یہ بیان نقل ہوا ہے کہ **اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مبینٌ** ''تو صریح غوی (نامعقول آدمی) ہے۔''

حضرت آدمؑ کسی اعتقادی گمراہی میں مبتلا نہیں ہوئے تھے اور نہ انہوں نے سرکشی کی راہ اختیار کی تھی، بلکہ شیطان کے فریب میں آنے کی وجہ سے ان کا قدم غلط رخ پر جا پڑا تھا۔ ان کی اسی حالت کو غویٰ بے راہ ہوجانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۱۴۸؎ جب حضرت آدمؑ کے جسم سے جنت کا لباس اتر گیا تو انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ اور اس پر نادم ہوئے۔ ان کی ندامت کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھایا کہ وہ گرتوں کو اٹھاتا ہے۔ اور ایسا اٹھایا کہ وہ مقبول بارگاہ ٹھہرے۔ ان کے گناہ کے داغ کو دھونے کے لئے ان کو توبہ کی توفیق عطاء فرمائی، یہاں تک کہ توبہ کے الفاظ بھی تلقین فرمائے اور ہدایت سے نوازا۔

اس واقعہ میں انسان کے لئے یہ سبق موجود ہے کہ اگر اس سے کوئی گناہ سرزد ہوجاتا ہے، اور وہ اس پر نادم ہوکر اپنے رب کے حضور توبہ کرتا ہے تو وہ اس کو معاف کردیتا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اٹھاتا ہے۔

اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ حضرت آدمؑ نبی تھے، کیوں کہ ان کی توبہ قبول کرنے کے بعد ان کو ہدایت دینے کا ذکر ہوا ہے۔ اس ہدایت سے مراد ایمان (عقیدہ) وعمل کی راہ ہے جس پر چل کر اللہ کی خوشنودی اور اس کے نتیجہ میں ابدی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس طرح پہلا انسان جو زمین پر آیا ہدایت یافتہ انسان تھا۔ اور چونکہ یہ ہدایت اسے اللہ تعالیٰ سے براہ راست ملی تھی، اس لئے وہ نبی تھا۔

۱۴۹؎ اس کی تشریح سورۂ اعراف نوٹ ۳۳؎ میں گزر چکی۔

۱۵۰؎ تشریح کیلئے دیکھئے سورۂ بقرہ نوٹ ۵۶؎۔

۱۵۱؎ یہاں مصیبت میں نہ پڑنے سے مراد آخرت کے عذاب میں مبتلا نہ ہونا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ بات اس طرح ارشاد ہوئی ہے۔ **فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ** ''ان کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

اور جو میرے ذکر سے رخ پھیرے گا اس کے لئے تنگ زندگی ہوگی۔ اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا میں تو بینا (آنکھوں والا) تھا؟ ارشاد ہوگا اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس پہنچی تھیں تو تو نے ان کو بھلا دیا تھا۔ اسی طرح آج تو بھی بھلایا جا رہا ہے۔ اس طرح ہم بدلہ دیں گے اس کو جو حد سے گزر گیا تھا۔ اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہیں لایا تھا۔ اور آخرت کا عذاب بہت زیادہ سخت اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ (القرآن)

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾

۱۲۴ اور جو میرے ذکر سے رخ پھیرے گا اس کیلئے تنگ زندگی ہوگی ۱۵۲؎ اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔ ۱۵۳؎

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾

۱۲۵ وہ کہے گا اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا میں تو بینا (آنکھوں والا) تھا؟

قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾

۱۲۶ ارشاد ہوگا اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس پہنچی تھیں تو تو نے ان کو بھلا دیا تھا۔ اسی طرح آج تو بھی بھلایا جا رہا ہے۔ ۱۵۴؎

وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

۱۲۷ اس طرح ہم بدلہ دیں گے اس کو جو حد سے گزر گیا تھا ۱۵۵؎۔ اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہیں لایا تھا۔ اور آخرت کا عذاب بہت زیادہ سخت اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾

۱۲۸ کیا ان لوگوں کیلئے یہ بات باعث ہدایت نہ ہوئی کہ ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ جن کی (اجڑی ہوئی) بستیوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں ۱۵۶؎۔ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں ۱۵۷؎۔ جو دانشمند ہیں۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾

۱۲۹ اگر تمہارے رب کی طرف سے ایک بات، پہلے ہی طے نہ پا چکی ہوتی ۱۵۸؎ اور ایک مدت، مقرر نہ کی گئی ہوتی ۱۵۹؎ تو عذاب ان کو گرفت میں لے لیتا۔

فَاصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَاۗئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾

۱۳۰ پس ان کی باتوں پر صبر کرو ۱۶۰؎۔ اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو ۱۶۱؎، سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے۔ اور رات کی کچھ گھڑیوں میں بھی تسبیح کرو اور دن کے حصوں میں بھی ۱۶۲؎، تاکہ تم خوش ہو جاؤ۔ ۱۶۳؎

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۳۱﴾

۱۳۱ اور نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو دنیوی زندگی کی اس زیبائش کو جو ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو دے رکھی ہے، تاکہ ہم انہیں آزمائش میں ڈالیں۔ اور تمہارے رب کا رزق ہی بہتر اور بہت باقی رہنے والا ہے۔ ۱۶۴؎

۱۵۲۔ "مَعِيشَةً ضَنكاً" (تنگ زندگی) سے مراد قلب وروح کی وہ تنگی ہے جو گھٹن کا باعث بنتی ہے۔ مال و دولت اور سامانِ عیش کی کتنی ہی فراوانی کیوں نہ ہو، اللہ کی یاد اور اس کی تذکیر (ارشاد وہدایت) سے منہ موڑنے کے نتیجہ میں نہ کبھی قلب کو طمانیت حاصل ہوتی ہے اور نہ روح کو سکون میسر آتا ہے۔ ایسا شخص ہمیشہ نفسیاتی مرض میں مبتلا رہتا ہے اور وہ ہے پریشانی اور بے چینی۔

آج جب کہ دنیا اس کے پرستاروں پر بہت وسیع ہوگئی ہے اکثر لوگوں کا حال یہی ہے، کہ بہت کچھ کمانے کھانے کے باوجود انہیں سکونِ قلب میسر نہیں ہے۔ اضطراب کی کیفیت ان کے چہروں سے ظاہر ہورہی ہے۔ اور کتنے ہیں جو زندگی سے تنگ آکر موت کو دعوت دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کو خوشی وانبساط اور سکون وطمانیت کی زندگی اسی صورت میں میسر آتی ہے، جب کہ وہ اپنے رب سے بندگی کا تعلق قائم کرکے اسے یاد کرتا ہے اور اس کی یاددہانی (قرآن) سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

۱۵۳۔ تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ بنی اسرائیل نوٹ ۱۰۲۔

۱۵۴۔ یعنی تجھے بالکل نظرانداز کیا جارہا ہے تیری طرف نظرِ عنایت نہیں کی جائے گی۔

۱۵۵۔ یعنی جس نے حد بندی سے تجاوز کیا تھا اور جو اپنے کو خودمختار سمجھ کر من مانی کرتا رہا۔

۱۵۶۔ مراد ثمود اور مدین وغیرہ کی تباہ شدہ بستیاں ہیں، جو شاہراہ عام پر واقع تھیں اور جن پر سے عربوں کا گذر ہوتا تھا۔ (مزید تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ حجر نوٹ ۷۸۔)

۱۵۷۔ نشانیاں اس بات کی کہ یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے، بلکہ ایک مدبر ہستی عدل وانصاف کے ساتھ اس پر حکومت کررہی ہے اور اس کی قوتِ قاہرہ کے آگے سب بے بس ہیں۔ وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے رسول بھیجتا ہے اور ان کی دعوت برحق ہے۔ جو قوم رسول کی مخالفت کرتی ہے اس پر اس دنیا میں بھی عذاب کا کوڑا برستا ہے۔

۱۵۸۔ مراد مہلت عمل ہے۔

۱۵۹۔ یعنی مہلت کی مدت۔

۱۶۰۔ یعنی ان کے الٹے سیدھے اعتراضات کو خاطر میں نہ لاؤ اور ان کی اذیت دہ باتوں پر صبر وتحمل سے کام لو۔

۱۶۱۔ تسبیح کرو یعنی پاکی بیان کرو، **بِحَمْدِ رَبِّکَ** یعنی اپنے رب کی حمد کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی پاکی اس کے گن گاتے ہوئے بیان کرو۔ اس ایمانی کیفیت کے ساتھ کہ اللہ ہر قسم کے نقص اور عیب سے پاک ہے۔ اور اس کے لئے خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔ تسبیح اور حمد کے کلمات زبان سے ادا کرو کہ یہ ذکر خالص عبادت ہے۔

تسبیح کے کلمات کی مثال ہے: **سُبحَانَ اللّٰہ** (اللہ کیلئے پاکی ہے) اور **لَا اِلٰہ اِلَّااللّٰہ** (اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں) اور حمد کے کلمات کی مثال ہے: **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ** (تعریف اللہ کیلئے) اور **اَللّٰہُ اَکْبَرُ** (اللہ سب سے بڑا ہے) اور جن کلمات میں دونوں پہلو سموئے ہوئے ہیں ان کی مثالیں یہ ہیں: **سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ** (پاک ہے میرا رب جو بلند شان والا ہے) **سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ** (میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں اس کی حمد کے ساتھ)

صحیح بخاری میں آخری حدیث جو امام بخاری نے نقل کی ہے وہ یہ ہے:

عن ابی هـــريرة رضی اللّٰه عنه قال قال النبیُّ صلی اللّٰه عليه وسلم كَلمتان حَبِيبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِی الْمِيزانِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ۔ (بخاری کتاب التوحید)

''ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دو کلمے ایسے ہیں جو رحمٰن کو نہایت محبوب ہے، زبان پر ہلکے مگر میزان پر بھاری ہیں۔

وہ ہیں **سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ** (اللہ کی میں پاکی بیان کرتا ہوں اس کی حمد کے ساتھ) **سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ** (اللہ کے لئے پاکی ہے جو عظمت والا ہے)۔''

اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ایک مخلص مؤمن کی زبان سے ان کلمات کا شعوری طور پر ادا ہونا اللہ کے نزدیک نہایت پسندیدہ عمل ہے۔ روزانہ ان کو بار بار دہرانا عین مطلوب ہے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ ذکر الٰہی کے معاملہ میں مسلمانوں کے مختلف گروہوں کا اندازِ فکر اور طرزِ عمل مختلف ہے۔ ایک گروہ اللہ کے معاملہ میں صحیح دینی شعور پیدا کئے بغیر ورد پر زور دیتا ہے۔ اسکے نزدیک کیفیت سے زیادہ کمیّت (مقدار) کی اہمیت ہے۔ دوسرے گروہ نے ذکر الٰہی کیلئے خاص ہیئتوں کا اہتمام کرنے اور ضربیں لگانے کا طریقہ اختیار کر رکھا ہے اور تیسرا گروہ جس کا انداز فکر جدید ہے ذکر الٰہی کی اہمیت کے معاملہ میں کوتاہ نظر واقع ہوا ہے اس لئے وہ اس کا کچھ زیادہ اہتمام نہیں کرتا۔ اس افراط وتفریط کے مقابلہ میں وہی طریقہ صحیح ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا اور قرآن کے منشا کو آپ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے؟

۱۶۲؎ اس تسبیح کے لئے دو اوقات کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا۔ اور وہ ہیں آفتاب کے طلوع اور غروب سے پہلے کے اوقات، یعنی فجر اور عصر کے اوقات کہ عبادت کے لئے یہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ پھر رات کے کچھ اوقات اور دن کے حصوں میں بھی تسبیح کرنے کی ہدایت فرمائی۔ دن کا ایک حصہ تو وہ ہوتا ہے جب سورج کچھ اوپر چڑھ گیا ہوتا ہے، اسے ضحیٰ اور اشراق کہتے ہیں۔ دوسرا حصہ ظہر کا ہوتا ہے اور تیسرا عصر کا۔

تسبیح کی یہ ہدایت پنج وقتہ نماز کی فرضیت سے پہلے دی گئی تھی۔ پنج وقتہ نماز کا حکم سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۸ میں دیا گیا جو سورۂ طٰہٰ کے چند سال بعد نازل ہوئی۔ تسبیح کا یہ حکم اسی طرح عام ہے جس طرح انفاق کا عام حکم مکہ میں دیا گیا تھا، اور جب زکوٰۃ فرض ہوئی تو انفاق کا عام حکم منسوخ نہیں ہوا بلکہ اس کی دو قسمیں قرار پائیں۔ ایک فرض انفاق جس کے لئے زکوٰۃ کی اصطلاح استعمال ہوئی اور دوسرا نفل انفاق جس کی ترغیب برقرار رہی۔ اسی طرح تسبیح کا جو حکم آغاز میں دیا گیا تھا اس کی تعمیل دو طرح سے مطلوب ہوئی۔ ایک پنج وقتہ نمازوں کی صورت میں اور دوسرے نفل نمازوں اور نفل اذکار کی صورت میں۔ چنانچہ حدیث میں بھی نماز کے بعد اذکار کی ترغیب دی گئی ہے۔

۱۶۳؎ یعنی اس عبادت کا ثمرہ یہ ہے کہ تم خوش اور شاد ہو جاؤ گے۔

معلوم ہوا کہ جس شخص کا دل اللہ کی تسبیح اور حمد وثنا میں لگتا ہے، اس کو قلبی مسرت حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں تو وہ نہال ہو جائے گا۔

۱۶۴؎ یعنی زر پرستوں کی شان وشوکت اور مال ودولت کو حریص نگاہوں سے نہ دیکھو، کہ یہ ان کے لئے آزمائش کا سامان ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ رزق کہیں بہتر اور پائیدار ہے جس کا وعدہ اللہ نے تم سے کیا ہے اور وہ ہے جنت کا رزق۔

اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر قائم رہو۔ ہم تم سے رزق نہیں مانگتے۔ رزق ہم تمہیں دیتے ہیں اور انجام کار تقویٰ کے لئے ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں یہ اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا۔ کیا ان کے پاس اگلے صحیفوں میں جو کچھ (بیان ہوا) ہے اس کی شہادت نہیں پہنچی؟ (القرآن)

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾

۱۳۲ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر قائم رہو ۱۶۵۔ ہم تم سے رزق نہیں مانگتے ۱۶۶۔ رزق ہم تمہیں دیتے ہیں اور انجام کار تقویٰ کے لئے ہے۔ ۱۶۷۔

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾

۱۳۳ یہ لوگ کہتے ہیں یہ اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا۔ کیا ان کے پاس اگلے صحیفوں میں جو کچھ (بیان ہوا) ہے اس کی شہادت نہیں پہنچی؟ ۱۶۸۔

وَلَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾

۱۳۴ اور اگر ہم اس سے پہلے ہی انہیں عذاب سے ہلاک کر دیتے تو وہ کہتے اے ہمارے رب تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل و رسوا، ۱۶۹۔ ہونے سے پہلے تیرے احکام پر چلتے۔

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾

۱۳۵ کہو ہر ایک انتظار میں ہے ۱۷۰۔ تو تم بھی انتظار کرو۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون سیدھی راہ پر ہے اور کس نے ہدایت پائی ہے۔ ۱۷۱۔

۱۶۵۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ خود بھی نماز کی پابندی کرے اور اپنے گھر والوں کو بھی اس کی تاکید کرے۔ اور صحیح طریقہ یہی ہے کہ اپنے گھر والوں سے اصلاح کا آغاز کرے۔ نماز کے معاملہ میں اپنے بیوی بچوں کی طرف سے غفلت کسی فرض شناس شخص کا کام نہیں ہوسکتا۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کا حکم پنج وقتہ نماز کی فرضیت سے بہت پہلے آ گیا تھا۔

۱۶۶۔ یہی بات سورہ زمر میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعِمُونِ ۔ (ذاریات:۵۷)

''میں نہ ان سے رزق چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت اور نماز کا جو حکم دیا ہے وہ اس لئے نہیں ہے کہ اس کا کوئی فائدہ اسے پہنچے گا۔ بلکہ یہ مطالبہ اس لئے ہے کہ بندوں میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔

۱۶۷۔ یعنی نماز سے تقویٰ کی صفت پیدا ہوتی ہے اور آخرت کی کامیابی ان ہی کے لئے ہے جو اپنے اندر یہ صفت پیدا کریں۔

واضح رہے کہ تقویٰ کا مفہوم برائیوں سے بچنا ہی نہیں بلکہ احکام کی تعمیل بھی ہے۔ یعنی منفی اور مثبت دونوں پہلو اس میں شامل ہیں چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

''کون کہتا ہے کہ تقویٰ محض برائیوں کو ترک کرنے کا نام ہے۔ تقویٰ تو ۔۔۔۔۔ جیسا کہ اگلے پچھلے اس کی تفسیر کرتے چلے آئے ہیں ۔۔۔۔۔ اوامر (احکام) کی تعمیل بھی ہے اور نواہی (ممنوعات) کو ترک کرنا بھی۔'' (مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲۰ ص ۱۳۲)

۱۶۸۔ مشرکین مکہ کا کہنا تھا کہ یہ شخص اگر واقعی رسول ہے تو کوئی حسی معجزہ کیوں نہیں دکھاتا۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ کیا جو کچھ اگلے صحیفوں میں مذکور ہے اس کی شہادت ان تک نہیں پہنچی؟ مطلب یہ ہے کہ تورات اور انجیل میں جو پیشین گوئیاں آنے والے رسول کے سلسلہ میں مذکور ہیں ٹھیک ٹھیک ان کے مطابق اس رسول کی بعثت ہوئی ہے۔ اور یہ شہادت اس کے رسول ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اس دلیل کے بعد کسی حسی معجزہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

واضح رہے کہ نزولِ قرآن کے وقت تورات و انجیل کے جو نسخے موجود تھے، ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں واضح طور پر متعدد پیشین گوئیاں موجود تھیں۔ لیکن بعد میں یہود و نصاریٰ نے کتنی ہی عبارتیں ان کتابوں میں سے غائب کر دیں، تاکہ قرآن کی حجت کے مقابلہ میں ان کے موقف کی کمزوری ظاہر نہ ہو جائے، اور کچھ عبارتوں کا ترجمہ ایسا کیا گیا کہ کسی کے پلے کچھ نہ پڑے۔ تاہم تورات و انجیل کے موجودہ ترجموں میں کچھ پیشین گوئیاں موجود ہیں، جن کا حوالہ ہم اس سے پہلے دیتے آئے ہیں۔ مثال کے طور پر تورات میں یہ پیشین گوئی موجود ہے:

''میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری (موسیٰ کی) مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔'' (استثناء ۱۸:۱۸)

اس پیشین گوئی میں ایک بات تو یہ کہی گئی ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے نبی برپا کروں گا۔ بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسمٰعیل ہیں اور حضرت محمد ﷺ بنی اسمٰعیل ہی میں سے تھے۔ آپ کے علاوہ کوئی رسول بنی اسمٰعیل میں نہیں ہوا۔ دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ وہ شانِ نبوت میں موسیٰ کی مانند ہو گا اور نبی ﷺ اسی شان کے نبی تھے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

''ہم نے اسی طرح رسول کو تم پر شاہد بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔'' (مزمل۔۱۵) اور تیسری بات یہ کہ ''میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ بھی اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔''

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا امتیازی وصف تھا۔ چنانچہ اللہ کا کلام آپ کی زبان سے ادا ہوا اور قرآن آپ کا معجزہ قرار پایا۔ گویا یہ معجزہ ٹھیک اس پیشین گوئی کے مطابق ہے جو تورات میں بیان ہوا ہے۔ یہ دلیل ہے آپ کے رسول برحق ہونے کی۔

واضح رہے کہ نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے اہل کتاب ان پیشین گوئیوں کی بنا پر آنے والے رسول کے منتظر تھے اور اس کا چرچا کرتے تھے۔ (دیکھئے سورۂ بقرہ آیت ۸۹) اس لئے عرب اس سے ناواقف نہیں ہو سکتے تھے۔

۱۶۹۔ ذلیل اپنی نگاہوں میں اور رسوا لوگوں کی نگاہوں میں۔

۱۷۰۔ یعنی ہر شخص اس انتظار میں ہے کہ رسول کی دعوت کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

۱۷۱۔ یعنی عنقریب تم دیکھ لوگے کہ نبی کی دعوت خیر و فلاح کا باعث تھی یا نہیں اور اللہ کی نصرت نبی کے ساتھ رہی یا تمہارے ساتھ؟ اور قیامت کے دن دو اور دو چار کی طرح تم پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ رسول اور اس کے پیرو ہی راہ راست پر تھے اور وہی کامیابی کی منزل پر پہنچ گئے۔

❑❑❑❑❑❑